"بہادر سنگھ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"پتاجی اِنہوں نے مجھے کان سے پکڑنے کا حکم دیا تھا۔" بہادر سنگھ نے گھبرا کر کان چھوڑ دیتے۔

پنڈت اُدم پرکاش چند ثانیے سر پکڑ کر بیٹھا رہا اور پھر وہ سورن سنگھ پر برس پڑا۔

"اس پاگل کو تم کہاں سے لے آئے تھے میرے پاس؟"

پنڈت جی پہلے میری بات سُنیے۔ اگر اِسے آپ نے کان پکڑنے کا حکم دیا تھا تو یہ بالکل بے قصور ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ سکول میں اپنے کان پکڑے جاتے ہیں۔ یہ گھر میں بھاگنے والی بکریوں کو یا اپنی بچھیا کو کان سے پکڑ کر روک لیتا ہے اور اس کام میں اتنا ہوشیار ہے کہ جب گائے کا کان پکڑ لیتا ہے تو بھی اُسے بھاگنے نہیں دیتا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں گائے یا بچھیا ہوں؟"

"نہیں پنڈت جی اِسے کانوں سے غلطی لگی تھی۔ اگر آپ اِسے سمجھا دیتے کہ کان کس طرح پکڑے جاتے ہیں تو یہ کبھی اس طرح نہ کرتا۔ یہ بیچارا کبھی سکول نہیں آیا۔ آپ جوتے ماریں لیکن اِسے معاف کر دیجیے۔ میں بھی آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ میرے سکول سے نکلتے ہی اسے کان پکڑنے کا حکم دیں گے اور یہ اپنے کان پکڑنے کے بجائے آپ کے کان پکڑ لے گا۔ پہلے آپ اسے کان پکڑنا سکھا دیں۔ پھر اگر اس نے حکم عدولی کی تو میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

پنڈت جی نے ایک لڑکے کو آواز دی۔

"او پیارے لال اِدھر آؤ۔ اِس بے وقوف کو کان پکڑ کر دکھاؤ۔"

پیارے لال نے جھٹ اپنے کان پکڑ لیے۔ اس کے بعد پنڈت جی نے بہادر سنگھ سے کہا۔

"اب تم اِسی طرح ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ گزار کر کان پکڑو اور جب تک میں

چھوڑنے کے لیے نہ کہوں اُس وقت تک پکڑے رکھو۔"

سورن سنگھ نے کہا "پنڈت جی یہ اگر مر بھی جائے تو آپ کے حکم کے بغیر کان نہیں چھوڑے گا۔"

یہ پہلا تجربہ بہادر سنگھ کے لیے کافی تکلیف دہ تھا۔ لیکن اُس نے آدھ گھنٹہ انتہائی سکون کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کی۔ پنڈت جی نے پوچھا

"کیوں نالائق۔ اب پتہ چلا کہ کان کیسے پکڑے جاتے ہیں؟"

بہادر سنگھ نے مُرجھائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جی جناب مجھے پتہ چل گیا ہے۔"

"اچھا چھوڑ دو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

بہادر سنگھ نے کان چھوڑ کر بڑی مشکل سے اپنی کمر سیدھی کی تو پنڈت جی نے کہا۔

"چونکہ تم نے جان بوجھ کر شرارت نہیں کی تھی۔ اس لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اب جاؤ۔ آج تمہیں چھٹی ہے۔ لیکن گھر جانے سے پہلے وہاں دکان سے قاعدہ تختی، قلم، دوات خرید لو۔"

یہ واقعہ بہادر سنگھ کے گاؤں کے لڑکوں میں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے دیہات کے لڑکوں نے بھی مشہور کرنے میں کافی دلچسپی لی تھی۔ اِس کے باوجود مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ جب بہادر سنگھ سے پوچھا جاتا تھا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس دیا کرتا تھا۔ اُسے کسی بات کی تردید کرنے کی عادت نہ تھی۔ لیکن ایک واقعہ اُس سال پیش آیا جب میں چھٹی جماعت میں بہادر سنگھ سے جا ملا تھا۔ ماسٹر جگن ناتھ بہت سے معاملات میں بہادر سنگھ کی ضد تھے۔ بہادر سنگھ جس قدر لمبا تھا وہ اسی قدر

چھوٹے نظر آتے تھے۔ جگن ناتھ کے سر کے پیچھے کے بال بہت چھوٹے تھے لیکن اگلے حصے کے بال اتنے لمبے تھے کہ جب وہ بکھرتے تھے تو ہونٹوں تک ان کا منہ چھپ جاتا تھا۔ بہادر سنگھ اس بات پر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کیا کرتا تھا۔ ایک دن آخری ہفتہ اتوار کی چھٹیاں گزارنے کے بعد بہادر سنگھ سکول آیا تو اُس نے سکول کا کام نہیں کیا ہوا تھا۔ ویسے بھی بہادر سنگھ کی عادت تھی کہ گھر جا کر سکول کے کام کو بہت کم ہاتھ لگاتا تھا۔ اِس دفعہ کام نہ کرنے والوں کو چار چار بید مارے گئے۔ بہادر سنگھ کی باری آئی تو ماسٹر جگن ناتھ نے اِتنے غصے کی حالت میں بید بلند کیا تو اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا بید ڈیسک پر لگا اور اِس کے ساتھ ہی سَر کی جنبش کے باعث ماسٹر جگن ناتھ کے بال ہاتھ پہ بکھر گئے۔ ماسٹر جی نے بید والے ہاتھ سے اپنے سر کے بکھرے ہوئے بال ٹھیک کیے اور دوبارہ زیادہ زور سے بید مارنے کی کوشش کی لیکن بہادر سنگھ نے پہلے سے زیادہ پھرتی سے ہاتھ پیچھے کر لیا اور ماسٹر جی آپے سے باہر ہو گئے۔ اُن کی تیسری کوشش یہ تھی کہ بہادر سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے اُوپر رکھ لیا اور بید مارنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر اب تم نے ہاتھ پیچھے کیا تو چمڑی ادھیڑ دوں گا۔
لیکن بہادر سنگھ اس مرتبہ بھی ہاتھ پیچھے کرنے سے نہ رہ سکا۔ بید پھر ڈیسک پر لگا اور ساری کلاس ہنس پڑی۔ ماسٹر جگن ناتھ نے ہانپتے کانپتے اپنے بال ٹھیک کیے پھر مضبوطی سے بہادر سنگھ کے دائیں ہاتھ کی کلائی اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور ایڑیاں اُٹھا کر پوری قوت سے بید مارا۔ بہادر سنگھ نے عین وقت پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بید ماسٹر صاحب کی کلائی پر لگا اور انہوں نے درد سے کراہتے ہوئے "تیرا بیڑا غرق" کہہ کر اپنی کلائی پکڑ لی۔ ماسٹر جگن ناتھ غصے کی حالت میں کانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور سیدھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ ہیڈ ماسٹر نے اُن کی کلائی سے رستا ہوا خون دیکھا تو پوچھا
"اوہو ایسا زخم آپ کو کیسے آیا؟"

"جناب یہاں بید لگ گیا تھا۔"
"کس نے مارا آپ کو بید سے؟"
"جی میرا اپنا بید لگ گیا تھا۔ وہ بدمعاش جو بہادر سنگھ ہے نا جی۔ اُس سے میں بہت تنگ آ گیا ہوں۔ اُس کا کوئی بندوبست کریں ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔"
ہیڈ ماسٹر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا "اِس وقت آپ کو خودکشی کی نہیں بلکہ ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ آپ فوراً ہسپتال جائیں اور اس کی مرہم پٹی کروائیں۔ اگر بہادر سنگھ نے کوئی شرارت کی ہے تو اُسے اِس کی پوری سزا دی جائے گی۔ لیکن آپ اپنے زخم کے علاج کی فکر کریں۔"
اِس عرصے میں سائنس ماسٹر کمرے میں آ گیا اور اُس نے ماسٹر جگن ناتھ کی کلائی دیکھتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا۔
"سَر ان کو چوٹ کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس پر سپرٹ لگا دی جائے تو درد کم ہو جائے گا۔"
ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "تو پھر جلدی کیجیے اور سپرٹ لگا کر انھیں ہسپتال لے جائیے۔"
سائنس ماسٹر انھیں لیبارٹری میں لے گیا اور وہاں رُوئی کا پھاہا سپرٹ میں تر کر کے اُن کی کلائی پر رکھتے ہوئے کہا۔
"ماسٹر جی صرف ایک منٹ تکلیف ہو گی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
اور ماسٹر جگن ناتھ کی یہ حالت تھی کہ جو غصہ اُسے بہادر سنگھ پر آیا تھا اسی قدر سائنس ماسٹر پر آ رہا تھا۔ اُس نے پھاہا اتارنے کی کوشش کی لیکن سائنس ماسٹر نے اُس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ چلّا رہا تھا۔
"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو میرا دل ڈوب رہا ہے۔"
ایک گھنٹہ بعد ماسٹر جگن ناتھ ہسپتال سے پٹی کروا کر واپس آیا تو اُسے پتہ چلا کہ

ہیڈ ماسٹر صاحب خود کلاس روم میں جا کر اس معاملے کی تحقیقات کر چکے ہیں اور انہوں نے بہادر سنگھ کو کچھ نہیں کہا۔ لڑکوں نے جو کچھ بتایا تھا اُس سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو جگن ناتھ کی بجائے بہادر سنگھ سے کچھ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم ماسٹر جی کی دلجوئی کے لیے بہادر سنگھ دوسرے سیکشن میں بھیج دیا گیا تھا۔

باب - ۱۸

گاؤں کے گرد پھلدار درختوں کے باغوں کے علاوہ کئی دوسرے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ جن پر مختلف اقسام کے پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ بعض پرندے خاص خاص موسم میں آیا کرتے تھے اور پھر موسم کی تبدیلی کے ساتھ فصل کے کھیتوں اور درختوں میں غائب ہو جاتے تھے۔ اُن کی آمد اور واپسی کے ایام میں اُن کے غول بڑی توجہ سے دیکھے جاتے تھے۔

گاؤں کی آبادی میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جس کی آمد و رفت کے ساتھ کبھی کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ عنصر شہد کی بڑی مکھیاں تھیں۔ جنھیں پنجابی زبان میں ڈومنا کہا جاتا ہے۔ شہد کی عام مکھیوں اور ڈومنے میں فرق یہ تھا کہ عام مکھی جب کسی درخت یا جھاڑی کے ساتھ چھتہ لگاتی تھی تو لوگ بہت خوش ہوتے تھے اور کچھ عرصہ بعد جب وہ اطمینان سے شہد اُتار لیتے تھے تو مکھیاں کہیں اور چلی جاتی تھیں۔

گاؤں میں دو چار آدمی ایسے ہوتے تھے جو چھوٹی مکھی کا شہد نکال کر بیچا کرتے تھے لیکن بڑی مکھی ڈومنا کی بات اور تھی۔ اُس سے شہد حاصل کرنا جان جوکھوں کا کام تھا اور جو شہد حاصل کرنا چاہتے تھے ایک مستقل دشمن سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کی آؤ بھگت کرتے تھے اور وہ نصف سے زیادہ شہد بھی لے جاتے تھے اور یہ بلا وجہ نہیں تھا۔ بڑی مکھی کسی درخت کے ساتھ گھر بنا لیتی تھی تو آس پاس کے رہنے والوں کو اپنی سلامتی کے لیے اِس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ کہ کوئی بڑی مکھی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ کیونکہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا ایک خطرناک دشمن کو بھرپور

حملے کی دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں بڑی نسل کی مکھیوں کا ایک طاقتور قبیلہ مستقل طور پر موجود رہتا تھا۔ جو کبھی اپنے پرانے گھر سے اچانک غائب ہو جاتا اور پھر اچانک یہ دیکھا جاتا کہ کسی دوسری جگہ اس نے ایک نئے چھتے کی تیاری کے کام کی ابتدا کر لی ہے۔

ایک سال انہیں گاؤں کی مسجد کا مینارہ پسند آ گیا۔ اور امام مسجد مولوی عبداللہ بہت فکرمند رہتے تھے کہ یہ مکھیاں اذان سن کر اُن پر حملہ نہ کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنا کھیس اپنے پاس رکھتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔ دوسرے سال ڈومنے کو پاس ہی پیپل کا ایک درخت پسند آ گیا۔ ایک سال اُس نے جامن کے اُس درخت پر قبضہ کر لیا تھا جس کا پھل باقی درختوں سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ لوگ یہ بہت سوچا کرتے تھے کہ جب بارشیں شروع ہوں گی اور جامن پکنے کا موسم آئے گا تو ڈومنا خود بخود کہیں چلا جائے گا لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی اور اُسے یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ سردیوں کے آغاز تک وہیں رہا۔ پھر ایک دن اچانک اُسے سوجھی کہ چوہدری غلام نبی کے باغیچے کے گرد گھرنے[1] کی باڑ کے اندر چھتہ لگا لیا۔

گاؤں سے دو اطراف کو جانے والے راستے اس باڑ کے قریب آ کر گزرتے تھے، اس لیے اس چھتے کی حفاظت گاؤں کی سلامتی کے لیے اہم مسئلہ بن گئی۔ ایک دن مولوی محمد عبداللہ وہاں سے گزرے اور انہوں نے چھتہ دیکھ کر کہا" چوہدری غلام نبی ! ان مکھیوں سے بچ کر رہنا، بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ میں نے ایک میلے میں انہیں تباہی مچاتے دیکھا تھا۔ ابھی تو سردیوں میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اونچے درخت چھوڑ کر ان جھاڑیوں میں چھتہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سال سردیاں بہت پڑیں گی، بارشیں خوب ہوں گی ________

اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو اپنے بچاؤ کے لیے عقل دی ہے

---

[1] ایک کانٹے دار جھاڑی جسے پھل بھی لگتا ہے۔ جو بچے شوق سے کھاتے ہیں۔

لیکن جب گرمیاں آئیں گی تو یہ مکھیاں بہت خطرناک بن جائیں گی۔ خدا کرے اس سے پہلے پہلے انہیں اپنا گھر تبدیل کرنے کا خیال آ جائے۔

چودھری غلام نبی نے کہا" مولوی جی ! ان کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔ جن لوگوں کو یہ علم ہو چکا ہے کہ یہاں ڈومنا لگا ہوا ہے۔ وہ دُور سے ہی راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ دیکھئے ساتھ والے کھیت میں کتنی پگڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں۔ کل صوبہ سنگھ دہائی دے رہا تھا کہ یہ مکھیاں میرا کھیت برباد کر دیں گی۔ جانکی داس نے اسے سمجھایا تھا کہ شہد کی مکھیوں کو سردیوں میں چھیڑنا پاپ ہے۔ جب گرمیاں آئیں گی تو میں تمہیں ایک چیز دوں گا دُھواں چھتے کے نیچے سلگا دینا تم دیکھو گے کہ مکھیاں کوسوں دُور چلی جائیں گی۔ مولوی محمد عبداللہ نے کہا" یار وہ جانکی داس پاگل ہے:
دھواں سلگانے کے لیے ان جھاڑیوں میں سے اُن کے چھتے کے نیچے کون جا سکتا ہے؟"

" مولوی جی ! سردیوں میں تو ان مکھیوں سے کوئی خطرہ نہیں اور اس کے بعد یہ خود ہی کسی اونچے درخت پر چلی جائیں گی۔ ورنہ انہیں کسی نہ کسی طرح اڑا دیا جائے۔ جانکی داس کہتا تھا میں انہیں اڑانے کے کئی طریقے جانتا ہوں، شہد نکالنے سے پہلے انہیں اڑا دینا بے وقوفی ہے۔ سائیں بڈھے شاہ کہتا تھا کہ شہد نکالنے کے لیے میں اپنے ایک مرید کو بلا لوں گا۔"



مارچ کے آخری دن تھے۔ گاؤں سے باہر حدِ نگاہ تک گندم کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ ہوا خوشگوار تھی۔ سائیں بڈھے شاہ اور اللہ رکھا صبح کے وقت گھر سے نکلے تو اللہ رکھا جو تھوڑی دیر پہلے چوہدری غلام نبی کی حویلی سے گنے کا تازہ رس پی کر آیا تھا۔ اس کے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ جانکی داس کے ڈیرے کے قریب سے گزرا تو حسبِ معمول وہ سر کے بل کھڑا تھا۔ سائیں بڈھے شاہ نے کہا" کیسا بے وقوف معلوم ہوتا ہے یہ"۔

سائیں جی یہ روز اسی طرح کرتا ہے۔ ابھی جب میں پہلے یہاں سے گزرا تھا تو یہ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ "دوسری ٹانگ کہاں گئی تھی؟" بڈھے شاہ نے پوچھا۔

" جناب دوسری ٹانگ بھی ساتھ ہی تھی، لیکن وہ اُس نے اُوپر اٹھا رکھی تھی۔ سائیں نے کہا۔ "وہ میں بھی اٹھا سکتا ہوں"

" جناب! سب ٹانگ اٹھا سکتے ہیں اور سر کے بل بھی سب ہی کھڑے ہو سکتے ہیں صرف لوگوں کے سامنے ایسا کرنا بے وقوفوں کا طریقہ ہے۔"

جانکی داس وہیں سے چلایا" او اللہ رکھے کے بچے! کیا بک رہے ہو؟"

سائیں بڈھے شاہ نے کہا۔"بھئی جانکی داس غصہ نہ کرنا۔ اللہ رکھے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ تم سر کے بل کھڑے ہو کر سن بھی سکتے ہو۔

میں غلام نبی کے رہٹ پر جا رہا ہوں تم بھی آجاؤ۔ وہاں کھلی جگہ بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔ تمہیں گنے بھی بہت اچھے ملیں گے۔"

جانکی داس نے بازوؤں پر وزن ڈال کر سر آگے کرتے ہوئے کہا۔

" ساجن! اس ورزش سے کان بھی تیز ہوتے ہیں اور آنکھیں بھی روشن ہو جاتی ہیں اور عقل بھی بڑھتی ہے۔" "صرف الٹا کھڑا ہونے سے"! سائیں بڈھے شاہ نے طنز کرتے ہوئے کہا

"یہ ہنسنے کی بات نہیں ساجن! عمر بھی بڑھتی ہے"۔ ـــــ یہاں تک کہہ کر جانکی داس پاؤں کے بل کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ساجن! حیران کس بات پر ہو۔ اگلے سال میری عمر پچاس سال ہو جائے گی تو میں یہ لٹیں کٹوا دوں گا۔"

"کسی پہچان والے کو بلا کر دکھا دینا! وہ ان کی لمبائی دیکھ کر بتا دے گا۔ کہ میری عمر کتنی ہے؟ اس کے باوجود میرا ایک بال سفید نہیں ہوا۔ دانت مضبوط ہیں۔ اگر آزمانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ بھاگ کر دیکھ لو۔ کسی درخت پر چڑھ کر آزما دیکھو۔ ورنہ بڑی نہر یا دریا میں میرے ساتھ تیر کر دیکھ لو۔ سردیوں میں صرف راکھ مل لینے سے مجھے کوئی کپڑا پہننے کی ضرورت نہیں

محسوس ہوتی۔"

اللہ رکھا نے کہا" اگر تم پچاس کے ہونے والے ہو تو مجھ سے بارہ تیرہ سال بڑے ہو گے لیکن یہ عقل کیسے مان سکتی ہے کہ صرف الٹا کھڑا ہونے سے انسان اتنا کچھ حاصل کر لیتا ہے؟"

"ساجن! صرف اُلٹا کھڑا ہونے سے نہیں! اس کے لیے کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہم سنیاسی لوگ ہیں اور جنگل کی بوٹیوں سے ہماری دوستی ہے۔ اُلٹا کھڑا ہونے کے علاوہ ہم کئی اور ورزشیں بھی کرتے ہیں اور ہر ورزش سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ اُس کے ساتھ کوئی خاص بوٹی استعمال میں لائی جاتے۔"

سائیں بڈھے شاہ نے کہا۔" یار کچھ ایسی باتیں ہمیں بھی بتا دو۔ آخر ہم تمہارے پڑوسی ہیں۔"

جانکی داس نے کہا۔" ساجن! یہ دنیا ایک بازار ہے یہاں نقد سودا ہوتا ہے۔ کچھ لینے کے لیے کچھ دینا پڑتا ہے۔ باتوں سے کام نہیں چلتا۔"

سائیں بڈھے شاہ کو پہلی بار اپنے پڑوسی کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اُس نے کہا۔

"یار! آج تک جو کام تم نے کہا ہے کیا وہ ہم نے نہیں کیا؟"

"ساجن! آپ نے ہم سے کوئی چیز مانگی ہے۔ جو میں نے نہیں دی؟ اگر آج سے ہم ایک دوسرے کے کام آنے میں اپنا فائدہ سمجھ لیں تو پھر جو میرا ہے وہ آپ کا ہے۔ جو آپ کا ہو گا وہ میرا ہو گا۔ جب میں کسی بوٹی کی تلاش میں نکلا کروں گا تو آپ کو ساتھ لے لیا کروں گا۔ اور جب کوئی آپ سے جن اور بھوت نکلوانے آیا کرے تو مجھے بلوا لیا کریں۔"

سائیں بڈھے شاہ نے کہا" بلانے کی کیا ضرورت ہے تم ہر وقت میرے پاس آسکتے ہو۔ اب میں کچھ گھومنے پھرنے کے بعد چوہدری غلام نبی کے رہٹ پر جاؤں گا۔ تم

بھی وہاں آجاؤ۔ وہاں کھلی جگہ بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے"۔

"سائیں جی میں بھوجن کرتے ہی وہاں آجاؤں گا"۔ جانکی داس نے کہا۔

وہاں سے چلتے ہوئے اللہ رکھا نے کہا۔ "سائیں جی آپ تازہ رس نہیں پئیں گے؟"

"اگر چوہدری غلام نبی کا بیلنا چل رہا ہو تو میں رس بھی پیوں گا اور یار تھوڑا سا گرم گڑ بھی لے آنا!"

"اس وقت میں گنے چوسنا چاہتا ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد سائیں بڈھے شاہ ایک کھلی جگہ رہٹ کے چھوٹے سے حوض کے قریب بیٹھا ہوا تھا جس کے اندر رہٹ سے نکلنے والے پانی کی دھار گرتی تھی۔ اُس کے نیچے پرالی بچھی ہوئی تھی جو اُسے ہر بچھونے سے زیادہ آرام دہ محسوس ہوتی تھی۔

غلام نبی نے سائیں کو دیکھتے ہی کہا۔

"آؤ سائیں جی! تشریف لاؤ۔ آج تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ عید کا دن ہے۔ یہ بتایئے کہ آپ کو کیا کھلایا جائے؟"

سائیں نے کہا۔ چوہدری جی بات یہ ہے کہ آپ کے گھر کی دال بھی دوسروں کی مُرغی سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔ جب میں یہاں سے کوئی چیز کھا کر جاتا ہوں تو مدّت تک کسی کے ہاں کھانے کا لطف نہیں آتا"۔

اپنے گھر کے کھانے کی تعریف سُننا چوہدری غلام نبی کی شخصیت کا ایک کمزور پہلو تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ آج خاص طور پہ کیا کھانا پسند کرو گے۔ یہاں ہوا بہت اچھی ہے۔ آپ کا اور اللہ رکھا کا کھانا یہیں پکایا جائے اور آپ کے ساتھ کوئی اور ہُوا تو اُسے بھی یہیں بلا لیا جائے گا"۔

سائیں نے کہا۔ "آپ کے گھر سے جو کچھ بھی آئے گا۔ وہ بہت اچھا ہوگا"۔

"سائیں جی! آج آپ کی پسند کی چیز چلے گی"۔

سائیں بڈھے شاہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا:

"ایک دفعہ میں نے آپ کے گھر سے مولی والے پراٹھے کھائے تھے"۔

"سائیں جی وہ مجھے بھی بہت پسند ہیں! جس وقت بھوک محسوس کریں اللہ رکھا یا پیراں دِتہ کو ہمارے گھر بھیج دیں۔ اور وہ آپ کے گھر میں بھی یہ پیغام پہنچا دے کہ پراٹھے وہاں پہنچ جائیں گے"۔

اللہ رکھا نے کہا۔ "چوہدری جی! میں نے رات ایک خواب دیکھا تھا جو بہت خوفناک تھا۔ لیکن بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی نیک بخت کو دیکھنے کے بعد پہلی تمام نحوستیں ختم ہو جاتی ہیں"۔

"وہ نیک بخت کون تھا؟" غلام نبی نے پوچھا؟

"جناب! آپ سے زیادہ نیک بخت اور کون ہو سکتا ہے، جن کا چہرہ دیکھتے ہی مولی کے پراٹھوں کی خوش خبری مل گئی"۔

غلام نبی نے کہا "میرا چہرہ آپ دیکھتے یا نہ دیکھتے جو چیز آپ کے نصیب میں لکھی ہے، وہ آپ کو ضرور ملے گی"۔

"آج موسم کچھ ایسا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ بہت سے مہمان آجائیں اور مولی کے پراٹھے کھائے جائیں"۔

"سائیں جی! آج کوئی خاص دن ہے؟"

"خاص تو نہیں! لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ میں بار بار سوچتا ہوں کہ جانکی داس صبح سویرے سر کے بل کیوں کھڑا تھا؟"

تھوڑی دیر بعد اللہ رکھا گنّے کے رس کا برتن اور ایک پتے پر گرم گڑ ڈالے

ہوتے کماد کی اوٹ سے نمودار ہُوا اور غلام نبی نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا سائیں جی! مَیں ذرا کیاری دیکھ آؤں۔ اللہ رکھا تم بھاگ کر ہمارے گھر میں کہہ دو کہ فوراً مولی کے پراٹھے تیار کئے جائیں۔ سائیں بڈھے شاہ اور ان کے مرید یہاں کھانا کھائیں گے اور کچھ پراٹھے اُن کے گھر بھی جائیں گے جو تم لے جاؤ گے۔ تازہ لسی کی بالٹی بھی یہاں بھیج دی جائے۔"

غلام نبی بیلچہ اٹھا کر چلا گیا تو اللہ رکھا نے کہا۔ "سائیں جی رس کا کٹورا بھر دوں؟"

"نہیں بے وقوف! رس پڑا رہنے دو مولی کے پراٹھے کھانے سے پہلے رس کون پیتا ہے؟"

"اور یہ تازہ گڑ بھی نہیں کھائیں گے۔ بہت اچھا ہے ابھی گرم ہے"۔

"یہ بھی ایک طرف چھپا کر رکھ دو، ورنہ جانکی داس آتے گا اور آتے ہی سب کچھ چٹ کر جائے گا!"

اللہ رکھا نے کہا "پھر وہ مولی کے پراٹھے بھی چٹ کر جائے گا۔"

"نہیں بھئی گنّے کے رَس کی اور بات ہے! لیکن ہندوؤں کے خوف سے وہ مسلمان کے گھر کا پکا ہُوا نہیں کھاتے گا۔

مَیں نے دیکھا ہے کہ در پردہ بعض اوقات سِکھ بھی مسلمانوں کے کھانے میں شریک ہو جاتے ہیں لیکن ہندوؤں نے اِس قدر تعصب پھیلا رکھا ہے کہ جانکی داس اس بات سے بہت جھجکتا ہے کہ اگر ہندو اُس کے مخالف ہو گئے، تو سکھ بھی اس سے منہ پھیر لیں گے۔"

"سائیں جی! چوہدری غلام نبی کے گھر والی بہت اچھا پراٹھا پکاتی ہے۔ بس اُن سے ایک پراٹھا چھپا کر جانکی داس کو لا دوں گا، اور اُس سے کہوں گا کہیں چُھپ کر کھا لو، وہاں تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا اور پھر سائیں جی دیکھنا وہ آپ سے ہر روز پوچھا کرے گا، سائیں جی چوہدری جی کے گھر سے پھر پراٹھے نہیں آئیں گے؟"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آج سے ہماری دوستی پکی ہو جائے گی"



بچن سنگھ اور تیجا سنگھ گاؤں کے سادہ دل لڑکے تھے۔ جنہوں نے رو پیٹ کر اپنی ماؤں سے ایک ایک آنہ حاصل کیا تھا اور اس کے عوض گاؤں کے پرچون فروش پیارے لال سے ربڑ کے غلیل حاصل کئے تھے۔ صبح سے اِدھر اُدھر نشانہ بازی کی مشق کرتے ہوئے شہد کے چھتّے کے قریب جا پہنچے۔

ایک نے دوسرے سے کہا۔ "دیکھنا بھئی! کہیں اُس طرف غلیل نہ چلا دینا!" دوسرے نے کہا۔ "بھئی میں بے وقوف نہیں ہوں! پتا جی کہتے تھے۔ انہیں چھیڑا جائے تو یہ جنگل کے شیروں اور چیتوں سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہیں"۔ پہلے نے کہا۔ "ہمیں سامنے سے چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے! چلو! اُدھر کماد کے کھیت سے نشانہ باندھتے ہیں۔ وہاں سے اگر کسی چالاک مکھی نے ہمیں دیکھ لیا تو بھی پاس ہی چچا ہری سنگھ کی حویلی ہے۔" یہ تدبیر دوسرے نے پسند کی اور دونوں نے کماد کے کھیت کے کنارے سے پودوں کی اوٹ میں چھپ کر غلیل چلا دیے

یہ دونوں کا پہلا نشانہ تھا۔ جو سیدھا چھتے پر جا کر لگا۔ اچانک بے شمار مکھیاں اُڑیں اور فضا میں پھیل گئیں۔ نشانہ بازی کرنے والے اُن کی گونج سے خوفزدہ ہو کر حویلی کی طرف بھاگے تو مکھیوں نے اُن پر حملہ کر دیا — لیکن انہوں نے ڈیوڑھی کے اندر پہنچتے ہی دروازہ بند کر لیا۔

دوسرے لوگوں کی بدقسمتی تھی کہ اللہ رکھا پراٹھوں کا چھابہ اور لسی کی دیگچی اٹھائے اُس راستے سے گذر رہا تھا اور مکھیوں کا پہلا بھرپور حملہ اُس پر ہُوا۔

رہٹ پر کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ چند منٹ بعد ان کا کیا حال ہونے والا ہے؟ دو عورتیں سائیں جی کے گھر کا پتہ پوچھتی ہوئی رہٹ پر پہنچ گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے سائیں جی

گنے چوس رہے تھے اور بڑی بے تابی سے پراٹھوں کا انتظار کر رہے تھے۔

عورتوں کا مسئلہ یہ تھا کہ اُن کی بھینسیں دودھ دینے کے وقت اَڑ جاتی تھیں اس لیے وہ سائیں جی سے آٹے کا پیڑا دم کروانے آئی تھیں۔ سائیں نے بیٹھے بیٹھے آٹے کے پیڑے پر تین پھونکیں ماریں اور عورتوں سے کہا "اب جاؤ بھینسیں اَڑی نہیں کریں گی۔ اور دیکھو! دودھ دوہنے سے کچھ دیر پہلے اُسے کچھ گڑ بھی کھلا دیا کرو۔" اچانک غلام نبی نمودار ہوا۔ اور اُس نے کہا۔" سائیں جی آپ کو بھوک لگ رہی ہے اللہ رکھا تو نہیں آیا میں خود گھر جاتا ہوں۔ غلام نبی وہاں سے چل پڑا لیکن پندرہ بیس قدم اٹھانے کے بعد اچانک رک گیا اور مڑ کر سائیں بڈھے شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سائیں جی! ایسا لگتا ہے کہ آپ کا مُرید باؤلا ہو گیا ہے۔"

عورتیں چند قدم دُور جا چکی تھیں، وہیں رُک گئیں اور سائیں اور جانکی داس اُٹھ کر گندم کے کھیت کی طرف دیکھنے لگے۔

اللہ رکھا کے دونوں ہاتھوں میں گندم کے پودے تھے جنہیں اکھاڑ کر وہ اپنے جسم کے کبھی دائیں کبھی بائیں طرف مار رہا تھا۔ اُس کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

"بچاؤ! بچاؤ! سائیں جی!"

سائیں جی نے جلدی سے گنا پھینک کر اپنا خاندانی ڈنڈا اٹھایا اور اُس کے ایک سرے سے اپنے گرد ایک دائرہ بنا لیا اور پھر اس انداز سے کھڑا ہو گیا جیسے لڑائی کے لیے تیار ہو۔ اُس کا ڈنڈا تلوار کی طرح ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ کبھی دایاں پاؤں آگے کر دیتا اور کبھی بایاں پاؤں۔ اُس کا چہرہ اتنا سرخ ہو گیا تھا کہ جانکی داس اُسے دیکھ کر گھبرا گیا اور اضطراری حالت میں جلدی سے اُس دائرے کے اندر آ گیا جسے اپنے ڈنڈے کی کرامت سے بڈھے شاہ نے ہر خطرے سے محفوظ کر لیا تھا۔

غلام نبی پر اُس کا اُلٹا اثر تھا۔

وہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا اور پھر چلایا، "مارے گئے! بی بیو! یہاں سے دوڑو۔ اُدھر نہیں! میرے ساتھ آؤ۔ عورتیں جنہیں اللہ رکھا کی چیخ پکار نے خوف زدہ کر دیا تھا۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر غلام نبی کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ اس نے پرالی کے ڈھیر سے ایک گٹھا اٹھاتے ہوئے کہا۔ بی بیو! یہ ڈُومنا ہے، پرالی کے اندر گھس جاؤ اور وہاں بیٹھی رہو۔" عورتیں سہم کر پرالی کے اندر بیٹھ گئیں اور غلام نبی نے انہیں پرالی سے اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ پھر پرالی کے ڈھیر میں چھپ کر اطمینان سے باقی منظر دیکھنے لگا۔

اللہ رکھا دہائی دے رہا تھا۔" جس بھوت کو آپ نے ڈنڈے مار کر اُس دن نکالا تھا وہ واپس آ گیا ہے۔ وہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ سائیں جی بچاؤ! اُس کے نیزے بڑے تیز ہیں۔ سائیں نے اُسے قریب آتا دیکھ کر زیادہ تیزی سے پینترے بدلتے ہوئے پوری قوت سے ڈنڈا گھمایا لیکن پھر اُس نے ہائے ہائے کہہ کر چیخیں مارنا شروع کر دیں اور وہ خاندانی ڈنڈا جو سب سے مؤثر ہتھیار تھا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اُدھر اللہ رکھا نے سائیں جی بچو کہہ کر حوض میں چھلانگ لگا دی۔

جانکی داس پوری قوت سے بھاگا چلا آ رہا تھا۔" بے وقوفو یہ شہد کی مکھیاں ہیں کسی نے ان کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے جو میرے ڈیرے کے قریب لگا ہوا تھا۔" اور اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور ہائے وائے کرتے ہوئے سائیں بڈھے شاہ سے لپٹ گیا۔ بڈھے شاہ نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے مرید سمیت حوض میں چھلانگ لگا دی۔ اب حوض تین آدمیوں کے لیے بہت ناکافی تھا۔

وہ جب بھی سانس لینے کے لئے جسم کے اوپر کا حصہ باہر نکالتے تھے تو مکھیاں منہ پر ڈنگ مارتی تھیں۔

اپنے ساتھیوں پر جانکی داس کو یہ سبقت حاصل تھی وہ کافی چھریرا جسم رکھتا تھا،
اور پیر و مرید دونوں کے نیچے گھس جاتا تھا۔ آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ
یہ سمجھ چکے تھے کہ سائیں اور اُس کے مُرید کا آخری وقت آ گیا ہے۔ غلام نبی پرالی میں سر چھپا
کر انہیں آوازیں دے رہا تھا۔ لوگو سائیں بڈھے شاہ کو بچاؤ، جانکی داس بھی مرنے والا ہے
کوئی ٹاٹ لے آؤ اور اِن کے اُوپر ڈال دو ورنہ انہیں ڈومنا زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

جانکی داس کو ایک تدبیر سوجھی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے پانی اچھالنا
شروع کر دیا۔ سائیں اور اللہ رکھا بھی اُس کی تقلید کرنے لگے اور مکھیاں ذرا دُور ہٹ
گئیں۔

پنڈت دینا ناتھ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اِس خیال سے نکلا تھا کہ اس خوشگوار
موسم میں جانکی داس سے گپ شپ لگاؤں گا

چوہدری غلام نبی کے رہٹ کی طرف دینا ناتھ نے گھوڑے کی باگ موڑ لی۔
راستے میں بپھری ہوئی مکھیوں نے اُن پر بھرپور حملہ کر دیا اور انہوں نے گھوڑے کی رفتار
تیز کر دی۔ رہٹ کے قریب پہنچ کر وہ کماد کے کھیت کے پاس گھوڑی سے گر پڑے۔

پنڈت جی کا دماغ جو پہلے سویا ہوا تھا اب تیزی سے کام کرنے لگا۔ جب
انہوں نے دیکھا کہ اُن کے گر جانے سے گھوڑے کی باگ ہاتھ سے نکل چکی ہے۔
ابھی تک مکھیاں اُوپر انتظار کر رہی ہیں کہ وہ ذرا ہلیں اور وہ بھرپور حملہ کر دیں۔
وہ اُٹھ کر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے کماد تک پہنچ گئے اور پھر بھاگ کر جان بچائی۔

حوض کے اندر سائیں جی پانی اچھالتے ہوئے تھک گئے تھے اور انہیں ہر
لمحہ اس بات کا احساس تھا کہ اُن پر وار کرنے والی مکھیوں کی تعداد لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی
ہے۔ جانکی داس نے کہا "سائیں جی! اگر آپ کے پاس کرامت ہے تو اُس کے دکھانے

کا وقت اب ہے"!

اللہ رکھا چلایا "ہاں سائیں جی! یہ ساری مستی! اُس بھوت کی ہے۔ خدا کے
لیے کچھ کیجئے۔"

جب حوض سے پانی کا اچھالنا بند ہوا تو چند مکھیاں حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں
سائیں بڈھے شاہ چلایا "بھوت کے بچے پانی اچھالتے رہو"

"سائیں جی میں آیا" دیوار کے کونے سے اللہ رکھا کی آواز آئی۔

سائیں چلایا "اللہ رکھے کے بچے! اِدھر آنے سے پہلے کوئی بڑا سا ٹاٹ لیتے آؤ
اور حوض کے اُوپر ڈال دو"

"سائیں جی! میں ٹاٹ لے آیا ہوں" میں نے چوہدری غلام نبی کی آوازیں سُن لی تھیں۔

"اب جلدی کرو۔ ہمارے اُوپر ڈال دو اور اپنے آپ کو بھی بچاؤ"!

"سائیں جی! میں دو ٹاٹ لے کر آیا ہوں"!

چوہدری غلام نبی کی باتیں سننے والوں نے کئی ٹاٹ جمع کر دیے۔

"اچھا! وہ دونوں ٹاٹ یہیں ڈال دو اور خود بھی یہیں ایک کونے میں دبک
جاؤ اور جب تک مکھیاں چلی نہ جائیں اِدھر اُدھر مت جاؤ۔ سُن لیا تم نے"!

"سائیں جی! ایک ٹاٹ چھوٹا ہے۔ وہ میں اپنے اُوپر لے کر آؤں گا۔ ورنہ مکھیاں
مجھے آپ تک نہیں پہنچنے دیں گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ خطرناک بھوت جو آپ نے نکالے
ہیں۔ یہ ڈومنا بن کر واپس آ گئے ہیں"۔

"لوگ بکواس کرتے ہیں اور تم بے وقوف ہو۔
اب جلدی کرو۔ ایک ٹاٹ ہمارے اُوپر ڈال دو اور دوسرا بھاگ کر لے آؤ"

حوض کے اُوپر ٹاٹ ڈالتے ہوئے دو تین مکھیوں نے اللہ رکھا کو کاٹ لیا
اور اُس نے ہائے ہائے کہتے ہوئے کماد میں پناہ لی۔ جب ڈنک کی جلن ذرا کم ہو گئی

تو اُس نے کمزور آواز میں کہا۔

"سائیں جی! یہ ٹاٹ جو میں نے آپ کے اُوپر ڈالا ہے۔ کافی موٹا ہے۔ آپ کو مکھیوں نے ڈنک تو نہیں مارا؟"

"نہیں! تم جاؤ!"

"سائیں جی"! اُس نے ڈرتے ہوئے پُوچھا ______

"اللہ رکھا مر تو نہیں گیا؟"

"نہیں! بے وقوف نظر نہیں آیا۔"

"نہیں میں نے آپ کے ساتھ جانکی داس کو دیکھا تھا۔

چوہدری جی! پنڈت دینا ناتھ آپ کے پاس ہیں؟

ڈومنے نے پنڈت دینا ناتھ پر بڑا سخت حملہ کیا تھا۔

وہ کہیں گھوڑی سے گر کر مر گیا ہے!"

"لوگ اتنے دہشت زدہ ہیں کہ اس کی لاش تلاش کرنے کے لیے بھی اس طرف آنے کے لیے تیار نہیں۔"

کماد سے آواز آئی "سائیں بڈھے شاہ! میں کماد میں چھپا ہوا ہوں۔ اپنے آدمی سے کہہ دیں کہ میرے لیے بھی ایک ٹاٹ لیتا آئے جو موٹا بھی ہو اور بڑا بھی!"

سائیں نے اللہ رکھا کو آواز دی

"اللہ رکھا ٹھہرو! میری بات غور سے سنو! ایک ٹاٹ دینا ناتھ کے لیے لے آؤ اور ایک اپنے اوپر ڈال لو۔ دیکھو ہمارے لئے دوا اور ٹاٹ ضرور لانا!"

"پنڈت جی میں ابھی ٹاٹ لاتا ہوں۔ کھیت کے کنارے رکھ دوں گا۔ اس کے بغیر باہر جھانک کر دیکھا تو تم مارے جاؤ گے۔ سُن لیا پنڈت جی؟"

"ہاں بھئی سُن لیا۔ آپ کی بڑی مہربانی!"

"ہمارے گاؤں سے کوئی میرا پتہ چلانے آئے تو انہیں بتا دینا کہ میں زندہ ہوں۔"

"سائیں جی! آپ نے دوا اور ٹاٹ کس لیے مانگے تھے؟"

"اوگدھے! ہم نے باہر بھی نکلنا ہے یا یہیں سردی میں ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔"

"فکر نہ کرو سائیں جی! آپ کو مرنے نہیں دوں گا۔ مَیں ابھی آتا ہوں۔"

مکھیوں کی توجہ کسی اور محاذ پر مبذول ہو گئی اور غلام نبی نے کچھ دیر غور سے ٹاٹ کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔

"بی بیو! یہاں سے نکلو اور سیدھے راستے پر جانے کی بجائے چری اور کماد کے کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی اپنے گاؤں پہنچ جاؤ۔ ان مکھیوں کا کوئی بھروسہ نہیں، کہ کس وقت اِس طرف آجائیں۔"

سائیں بڈھے شاہ کی آواز سنائی دی۔

"چوہدری جی آپ کہاں چھُپے ہوئے ہیں؟"

"سائیں جی! وہ کالا بھوت حملہ کرنے سے پہلے میرے کان میں کہہ گیا تھا کہ تم چپکے سے پرالی کے ڈھیر میں چھپ جاؤ اور مجھے ان لوگوں کا دماغ ٹھیک کرنے دو۔ جنہوں نے مجھے بہت ستایا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ ڈومنے کی فوج لا رہا ہے۔ ورنہ مَیں آپ کو خبردار ضرور کر دیتا۔"

"لیکن اللہ رکھا کو آپ نے مجھ سے پہلے دیکھا تھا۔"

"سائیں جی! میں سچ مچ یہی سمجھا تھا کہ یہ باؤلا ہو گیا ہے۔

اور کالا بھوت اس سے پہلے میرے کان میں یہ کہہ گیا تھا کہ آج اُس کے دشمنوں کی شامت آنے والی ہے۔"

"باقی لوگ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟"

"ابھی تک وہ زندہ ہیں، لیکن تھوڑی دیر اور یہاں رہنا پڑا تو ہم تینوں مر جائیں گے۔"

"چوہدری جی! ان خوفناک مکھیوں کو یہاں سے ہٹائیے!"

"اس وقت تو وہ یہاں نظر نہیں آ رہیں لیکن شام تک یہ جگہ محفوظ نہیں۔"

جانکی داس کی آواز آئی۔ "چوہدری جی! اچھی طرح دیکھ کر بتانا! تاکہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل آؤں۔"

"تم تھوڑی دیر کے لیے کیوں باہر آنا چاہتے ہو؟"

"چوہدری جی! میرا جسم سن ہو گیا ہے۔ اپنے ڈیرے پہنچ کر علاج معالجہ کراؤں گا۔ وہاں میرے لیے کئی من جلانے کی لکڑی جمع ہے۔"

میں ڈیرے پہنچ کر اتنا بڑا الاؤ جلاؤں گا کہ مکھیاں دور سے دیکھ کر ڈر جائیں گی۔

اگر آگ زیادہ ہو تو بھوت بھی بھاگ جاتے ہیں۔

مجھے سردی اتارنے کے لیے کئی گھنٹے تک آگ کے سامنے بیٹھنا ہوگا۔"

جانکی داس نے غلام نبی کے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک طرف سے تھوڑا سا ٹاٹ سرکا کر باہر دیکھا اور پھر اچانک حوض سے باہر نکلا تو وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔

وہاں بچھی ہوئی پرالی سے کچھ دور جا کر اس نے سر ڈھانپ لیا اور چند قدم ڈگمگاتا ہوا آگے بڑھا۔ اور پھر قدرے تیز رفتاری سے اپنے ڈیرے کی طرف چل دیا ———

سائیں بڈھے شاہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"جانکی داس! مکھیاں چلی گئی ہیں؟

ارے بولتے کیوں نہیں؟"

غلام نبی نے ہنستے ہوئے ٹاٹ اٹھا کر ایک طرف کر دیا اور کہا۔

"جانکی داس اپنے ڈیرے پر پہنچ چکا ہے۔ آپ بھی باہر آ سکتے ہیں۔"

پیرا اور مرید دونوں بری طرح کانپتے ہوئے باہر آتے اور زمین پر لیٹ گئے چند ثانیے بعد بڈھے شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور فکر مند ہو کر بولا۔

"چوہدری جی وہ پھر تو نہیں آ جائے گا؟"

غلام نبی کا برا حال ہو چکا تھا۔ اس نے کہا

"کالا بھوت! آ بھی جاتے تو اب آپ کی شکل اتنی بدل چکی ہے کہ وہ آپکو نہیں پہچان سکے گا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے ہاں بچے بھی آپ کو دیکھ کر بھاگ جائیں گے اور ابھی تو آپ کے چہرے پر سوجن آنی شروع ہو گئی ہے اور سائیں جی اپنے مرید کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو ڈر نہیں آتا اس سے؟"

سائیں جی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "وہ مکھیاں پھر آئیں گی؟"

اتنے میں پنڈت دینا ناتھ نے سر نکالا تو اللہ رکھا نے کہا۔ "پنڈت جی! پنڈت جی اب آ جاؤ! ڈومنا یہاں سے جا چکا ہے"۔ پنڈت دینا ناتھ کماد سے بڑی احتیاط سے ادھر ادھر دیکھ کر باہر نکلا۔ اس کا چہرہ اس قدر بری طرح سوجا ہوا تھا کہ اللہ رکھا بھی اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔

پنڈت دینا ناتھ نے چوہدری غلام نبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چوہدری جی! یہ ڈومنا نہیں تھا کوئی آفت تھی جس نے مجھے گھوڑی سے اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ یوں تو بھگوان کا شکر ہے کہ میرے اندر اتنی عقل تھی کہ میں زمین پر رینگتا ہوا، کماد کے اندر چھپ گیا تھا۔ ورنہ آج میرا بولو رام ہو گیا تھا۔"



اُس کے گاؤں کی عورتیں وہاں پہنچ کر عجیب و غریب داستانیں سنا رہی تھیں۔ انہوں نے غلام نبی کے مشورے پر پرالی کے ڈھیر میں چھپنے کے بعد آنکھیں کھول کر بہت کم اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔ مگر جتنا کم دیکھا تھا اتنی ہی زیادہ اُس کے متعلق داستانیں نمک مرچ لگا کر بیان کر رہی تھیں۔

مثلاً کالے بھوت کا تذکرہ، مہیب صورت بھوت کے ناقابلِ یقین کارناموں کی تفصیلات میں تبدیل ہو گیا جس کے آگے پیچھے ڈومنے کی فوجیں تھیں۔

اللہ رکھا کو شہد کی مکھیاں ڈنک مارتیں تو وہ دہائی دیتا تھا۔

"سائیں جی! کالے بھوت کو اپنے ڈنڈے سے مار بھگاتیے"!

پھر کچھ خواتین سائیں بڈھے شاہ کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر اتنی متاثر ہوئیں کہ اُس کے مرید اللہ رکھا اور بدقسمت سادھو جانکی داس کی حرکات۔۔۔۔ خصوصاً سر کے بل کھڑا ہونے کے مضحکہ خیز رویہ کا پرچار ہونے لگا۔

خواتین نے کہا "خدا بھلا کرے۔ چوہدری غلام نبی کا جس نے ہمیں پرالی کے ڈھیر میں چھپا دیا اور ہم بچ گئیں۔

پنڈت دینا ناتھ کی گھوڑی سوار کے بغیر گھر پہنچی تھی، اِس لیے یہ خبر دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ کہ دینا ناتھ مر چکا ہے۔ شام تک گاؤں کے لوگ اپنے گھروں میں چھپے رہے۔ رات کے وقت دیر تک وہ ڈومنا کے واقعات ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ اگلی صبح یہ خبر پھیل گئی کہ ڈومنے نے گاؤں کے شمال میں پیپل کے بہت بڑے درخت کے ایک موٹے سے تنے کے ساتھ اپنا نیا گھر بنا لیا ہے۔

تیسرے دن سائیں بڈھے شاہ نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں وہ اپنی کشادہ بیٹھک کے اندر بستر پر پڑا ہوا تھا اور کمرے کے اندر و باہر اُس کے چند تیماردار نیچے چٹائی پر بیٹھے ہوتے تھے اور چند پیچھے کھڑے تھے۔ بیٹھک کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کھاٹ پر اللہ رکھا اپنے اوپر رضائی لیے اُونگھ رہا تھا۔ لوگ ان دونوں کو بے ہوشی کی حالت میں رہٹ سے اٹھا کر لاتے تھے۔ اِس لیے پیر جی جنہیں خود تیز بخار تھا۔ کچھ دیر حیرت میں ڈوبے رہے پھر اچانک ان کی نظر تیمارداروں میں سے ایک ایسے آدمی پر مرکوز ہو کر رہ گئی جو دوسروں کے لیے اجنبی تھا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"لوگو! سچ بتاؤ کہ ہم مرے ہوئے ہیں یا زندہ؟"

"سائیں جی! ایک آدمی نے جواب دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا ہے۔ پرسوں سے جب کہ آپ کو چوہدری غلام نبی اُٹھا کر یہاں لائے تھے۔ آپ بے ہوش تھے۔ اللہ رکھا بھی بے ہوش تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ حکیم نے آپ کو دیکھتے ہی نائی بلوا لیا"۔

"سائیں بڈھے شاہ" تم صاف بات کیوں نہیں کرتے" کہ تم سب مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے کہیں سے اس قاتل کو تلاش کر کے میرے لیے لے آئے ہو۔ یہ ظالم فصد کھول دیتا ہے تو ہاتھی بھی چند سانس نہیں لے سکتا۔ میرے لئے نائی اس نے اِس لیے بلوایا ہو گا کہ میرے مریدوں نے مجھے اگر تڑپتا ہُوا دیکھ لیا تو اس کی شامت آ جائے گی"۔

ایک آدمی نے کہا۔

"سائیں جی! نائی نے آپ کے جسم سے صرف شہد کی مکھیوں کے ڈنگ نکالے تھے۔ اور اس کے لیے فصد نہیں کھولا گیا صرف موچنا استعمال کیا گیا ہے"۔

"یار! کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ تم اِسے نہیں پہچانتے۔ مگر میں اس بدمعاش کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ وہ حکیم ہے جو صرف فصد کھولنا جانتا ہے۔ مَیں اپنی آنکھوں سے اس کا کارنامہ دیکھ چکا ہوں۔ یہ وہی بدمعاش ہے جو چوہدری شیر علی کی جان لینے کے بعد کہیں غائب ہوگیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ مرگیا ہے۔ میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا کہ یہ مرگیا ہوگا اَب اگر میرے بُرے دن آئے ہوتے تھے اور یہ ایسے وقت میں وہاں پہنچا تھا جبکہ میں بخار میں بے ہوش ہوچکا تھا۔ اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا اور اس کے ہاتھوں موت میرے نصیب میں لکھی جاچکی ہے اور یہ کہہ کر میرا علاج کرنا شروع کردیا ہے کہ اس بدمعاش نے نائی کو شہد کی مکھیوں کے ڈنک نوچنے کے لیے بلایا تھا۔ نائی نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے دیکھا۔

"سائیں جی! آپ مجھ سے ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ مجھے اللہ رکھا نے ڈنک نکالنے کے لیے کہا تھا۔ آپ کے بعد میں نے اللہ رکھا اور جانکی داس کے جسم سے بھی ڈنک نکالے ہیں۔

صبح پنڈت دینا ناتھ کے گھر بھی مجھے بلایا گیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک حسین بخش کو کسی کی فصد کھولنے کا موقع نہیں ملا۔"

حسین بخش نے کہا۔

"سائیں جی مَیں نے فصد کھولنے سے توبہ کرلی ہوئی ہے اور یہاں سے چار کوس دُور دوکانداری کرتا ہوں۔"

"لیکن میرے گھر کا راستہ تمہیں کس نے بتا دیا۔"

"جناب! مَیں نے کسی صورت اس کام کو نہیں کرنا تھا۔ وہ جو آپ کا مُرید اللہ رکھا ہے یہ کل میرے پاس پہنچ گیا تھا اور میرے پاؤں پر گر پڑا تھا کہ خدا کے لیے

ہمارے سائیں جی کی جان بچاؤ۔"

بڈھے شاہ نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اللہ رکھا او اللہ رکھا!"

"جی سائیں جی!" اللہ رکھا نے کہا۔

"بدمعاش تمہیں کب سے اِس کے متعلق معلوم تھا؟"

"سائیں جی! مَیں نے اپنی بیوی کے علاج کے لیے انہیں پچھلے سال بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا۔"

"بدمعاش تم میری فصد کھلوانے کے لیے اسے بلانے گئے تھے؟"

"نہیں سائیں جی! اِس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ مَیں اب کسی مریض کا خون نہیں نکالتا۔"

سائیں بڈھے شاہ نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ کا شکر کرو کہ حسین بخش نے آٹھ پہر یہاں گذارے ہیں اور اس گاؤں کے لوگ بال بال بچ گئے ہیں۔ اَب اِسے روٹی کھلا کر یہاں سے روانہ کردو، اور اس بات کا خیال رکھو کہ جاتے جاتے کسی کو کوئی دوائی نہ دے جائے۔ ایسے حکیم کے پاس ایسی دوائیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ جو فصد کھولنے سے زیادہ خطرناک ہوں۔ ہم پر ایک مصیبت ٹوٹنے کی آئی تھی اور پھر تم حسین بخش کو لے آتے ہو۔ اِس بدمعاش کو جلدی سے یہاں سے نکالو ورنہ گاؤں کے لوگ اسے مار ڈالیں گے اور پولیس ہمیں پکڑ لے گی۔ او بدمعاش کے بچے بھاگ جاؤ، ورنہ مَیں غلام نبی کو اطلاع دیتا ہوں۔"

حسین بخش اٹھا اور بھاگتا ہوا کماد میں روپوش ہوگیا پھر یہ کسی کو معلوم نہ ہُوا کہ وہ کہاں گیا ہے۔

گاؤں کے مغرب کی طرف گرم کپڑے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ریلوے سٹیشن اور ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں جب حکومت نے مزدوروں کی کمی محسوس کی، تو جنوبی ہندوستان سے کچھ بھیل وہاں بھیج دیے گئے۔ شروع شروع میں انہیں ایک وسیع چاردیواری کے اندر رکھا جاتا تھا اور پھر چند برس بعد اُن میں سے کچھ واپس چلے گئے تھے اور کچھ پنجاب میں ہی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔

بھیلوں کے جس گھرانے کو ہمارے گاؤں کے ایک سکھ زمیندار نے مکان بنانے کے لیے کچھ جگہ دی تھی۔ اس کے سرکردہ آدمی کا نام بلّو تھا۔ بلّو کتوں کے ساتھ شکار کھیلا کرتا تھا۔ اور جب کبھی وہ جنگلی بلا مار کر لاتا تھا۔ تو بھیل خوشی سے ناچتے اور گاتے، ویسے ہر جانور کھا جایا کرتے تھے لیکن جنگلی بلے کی خاص خوشی منائی جاتی تھی۔ جب علاقے کے بڑے شکاری نکلتے تھے۔ تو بلّو اُن کے ساتھ ہو جایا کرتا تھا خرگوش شکاری لے جاتے تھے اور گیدڑ یا جنگلی بلا بلّو کو مل جاتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی شکار دیکھنے جایا کرتا تھا۔

شکاری عام طور پر پردیسی درختوں کے آس پاس کھلی جگہ میں جمع ہوتے تھے۔ پھر مختلف سمتوں سے ہانکے شکاری کتے شکار گھیر کر لاتے تھے۔ جب کوئی جانور کماد کے کھیت سے نمودار ہوتا تھا۔ تو تازی کتوں کو چھوڑ دیا جاتا، جو تھوڑی سی دوڑ کے بعد شکار پکڑ لیتے تھے۔ اور اگر پکڑے جانے والا جانور جنگلی بلا ہوتا تھا تو بلّو خوشی سے ناچتا تھا وہ ہر شکاری اور اس کے باپ دادا کا نام لے لے کر اُسے دعائیں دیتا تھا۔ ہم اُس کی حرکتوں پر ہنسا کرتے تھے۔

اسکول والے ہندوؤں، خاص کر دینا ناتھ برہمن کو اس بات پر اعتراض تھا کہ پردیسی درختوں کی پوتر دھرتی پر پاپ کیا جاتا ہے لیکن شکار کرنے اور شکاریوں کو دیکھنے والے اُس کے اعتراضات پر کوئی توجہ نہ دیتے تھے۔

پڑوس کے گاؤں کا سردار بیلا سنگھ جس نے دس پندرہ کتے پال رکھے تھے اور جسے تیتر اور بٹیر پکڑنے کا بھی بے حد شوق تھا، دینا ناتھ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے

کہا تھا: "تمہیں یہ دُعا کرنی چاہیے کہ خدا وہاں تمہیں اگلے جنم میں جنگلی بلا نہ بنائے، ورنہ بلّو بھیل تمہارے لئے اِتنا خطرناک ہے۔ کہ اگر تم چوہے کے بِل میں بھی چھپ جاؤ تو تمہیں نکال کر کھا جائے گا۔"

دینا ناتھ کو غصہ تو بہت آتا تھا۔ لیکن بیلا سنگھ سے کسی کو بحث کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میں اس کی وجہ شاید نہیں بتا سکتا لیکن پردیسی درختوں سے مجھے اُس دن ہی سے دلچسپی ہو گئی تھی جب میں نے یہ سُنا تھا۔ کہ وہ کسی نامعلوم ملک سے بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ اور جب پچھلے پہر چکّی پیسنے والی عورت نے انہیں دیکھ کر دہائی مچانی شروع کی تھی تو وہ جس جگہ تھے وہیں رُک گئے تھے۔

میں اسکول سے چھٹی کے بعد بسا اوقات اپنے ساتھیوں کو پردیسی درختوں کی طرف لے جایا کرتا تھا۔ ہم وہاں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ چند درختوں کے گرد چبوترے بنے ہوئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ چند سادھو یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پھر ایک رات وہ کسی چیز سے ڈر کر بھاگ گئے۔

میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا تھا، لیکن رات کے وقت اگر مجھے بھی کوئی کہتا کہ تم کسی پردیسی درخت کو ہاتھ لگا آؤ تو شاید میں یہ جرأت نہ کرتا۔ وہاں ہر شام عجیب سی اداسی چھا جاتی تھی۔

میں شہر کے اسکول میں ساتویں جماعت میں تھا۔ ایک دوپہر میرے چچا جان نے مجھے ڈیوڑھی کی طرف سے آواز دی۔ میں باہر نکلا تو اُن کے سامنے بلّو بھیل رو رہا تھا۔

"چودھری صاحب" وہ کہہ رہا تھا "میں تباہ ہو گیا ہوں، اُس ظالم نے ایک کتا جان سے مار دیا ہے۔ دوسرے کو بُری طرح زخمی کیا ہے۔ میں سردار بیلا سنگھ کے پاس گیا تھا۔ وہ اپنا ایک چھوٹا کتا اور ایک بڑا کتا ساتھ لے کر خود میرے ساتھ گئے لیکن چودھری صاحب" بڑی مشکل سے سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا "مجھے سردار بیلا سنگھ بھی طعنے دیں گے اُس کے چھوٹے کتے کی صرف ایک ہی چیخ سُنائی دی اور وہ یہ کہہ کر گالیاں دے کر چلے گئے کہ اندر کوئی

بلا ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ کھوکھلے تنے کو آگ لگا دی جائے مگر پردیسی درخت کو میں آگ لگانے کا پاپ نہیں کر سکتا۔ آئندہ میں اس طرف شکار کھیلنے بھی نہیں آؤں گا۔

اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میں مر جاؤں گا۔ سردیاں سر پر آ رہی ہیں مجھے اگر بلا نہ ملا تو میں بیمار ہو جاؤں گا۔

چودھری جی! وہ باہر ضرور نکلے گا۔ آپ چھوٹے چودھری کو اجازت دے دیں میں انہیں ساتھ لے جاؤں گا۔" "بھئی تم یوسف کو راضی کر لو، اگر یہ تمہاری مدد کرنا چاہے تو میں اسے نہیں روکوں گا۔" بلّو نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے (گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر کہا:

"سرکار! آپ کی تھوڑی سی تکلیف سے میری جان بچ جائے گی۔

وہ جنگلی بلا پنڈت دینا ناتھ سے بھی موٹا ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو اس کی آواز دُور دُور تک سنائی دیتی ہے بس آپ کو صرف ایک فائر کرنا پڑے گا" میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا:

"بلّو! میں نے تمہیں کئی بار پاؤں پکڑنے سے منع کیا ہے۔ آئندہ ایسا کیا تو اچھا نہیں ہو گا۔

تم بلّے کا خیال رکھو! میں اطلاع ملتے ہی تمہارے ساتھ چل پڑوں گا"

بلّو نے کہا۔

"جناب وہ جس وقت ملے گا، ہمیں یہاں اطلاع پہنچ جائے گی۔ میں اپنے دو ساتھی وہاں چھوڑ آیا ہوں"

میں صبح کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلا تو بلّو راستے میں کھڑا تھا۔

"جناب! چودھری جی وہ نکل آیا ہے"۔ اس نے کہا۔

"میں آپ کے نوکر سے بھی کہہ آیا ہوں کہ وہ آپ کے گھوڑے پر زین ڈال دے"

"اچھا بلّو تم بھاگو میں آتا ہوں"

تھوڑی دیر بعد میں بندوق اٹھائے سرپٹ گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ راستے میں بلّو کو دیکھ کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور کہا، "بلّو میرے پیچھے بیٹھ جاؤ"

بلّو ہچکچایا "نہیں! سرکار! میں ابھی پہنچ جاؤں گا اور میرے آدمی آپ کے انتظار میں کھڑے ہوں گے"۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

کچھ دیر بعد بلّو ہانپتا ہوا پردیسی درختوں کے قریب پہنچا تو میں بلّے پر فائر کر چکا تھا اور اس کے ساتھی نعرے لگا رہے تھے۔ مار لیا، مار لیا! اور بلّو نے وہیں سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس بلّے کی لاش کا جلوس نکالا گیا۔ پہلے بلّو اور اس کے ساتھی اُسے سردار بیلا سنگھ کے گاؤں میں لے گئے" اور پھر اپنے گاؤں میں اسے لے آئے۔

اگلے روز دو مُردہ کتوں کی لاشیں ملیں جن میں سے ایک بلّو کا تھا اور دوسرا بیلا سنگھ کا۔ لاشیں کھوکھلے تنے سے نکالی گئیں۔ اسی روز سردار بیلا سنگھ میرے چچا سے گاؤں آ کر ملا۔ چچا نے مجھے بلایا تو سردار جی نے ایک پنجرہ مجھے دیتے ہوئے کہا:

"بیٹا! اس میں بیس بٹیرے ہیں اور وہ سب تمہارے لیے ہیں"

میں نے چچا کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر پنجرہ پکڑ لیا اور بھاگتا ہوا اندر چلا گیا۔



آٹھویں جماعت کے آخری ایام میں اپنے گاؤں کے ساتھیوں کی ایک حماقت کے باعث میری زندگی میں ایک غیر متوقع انقلاب آیا۔ بورڈنگ ہاؤس کی عمارت بن چکی تھی اور اس عمارت میں اب داخل ہونے والے طلبا کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکے جن کے گھر دُور تھے، اُن کے لیے ہاسٹل میں داخلہ لینا ایک مجبوری تھی لیکن ہمارے امریکی پرنسپل نے جو چار کشادہ کمرے بنوائے تھے اُن میں سے ایک بھی پوری طرح نہیں بھرا تھا۔ اب اُستاد صاحبان نے ان لڑکوں پر بھی توجہ دینا شروع کر دی تھی جن کے گاؤں اسکول سے تین میل کے دائرہ کے باہر تھے۔ میرا گاؤں اسکول سے بمشکل ڈیڑھ دو میل تھا۔ اِس لیے مجھے اس سے کوئی پریشانی

نہ تھی۔ بہر صورت ہر طالب علم کو بورڈنگ ہاؤس میں داخلہ لینے کی ترغیب دلانے کا یہ طریقہ نکالا گیا۔ کہ کبھی رات کو اسکول کی کوئی تقریب منعقد کی جاتی یا کوئی "خاموش فلم" دکھائی جاتی۔ تو لڑکوں کو یہ بتا دیا جاتا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو رات بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہر سکتے ہیں۔ کبھی کوئی مُعلّم یا اُستاد چند دن کے لیے اپنے مضمون کی خاص کلاسز لیتا تھا اور لڑکے اِسے بھی ایک مشغلہ جان کر اپنے بستروں اور کھانے کے برتنوں سمیت بورڈنگ ہاؤس میں پہنچ جاتے تھے اور اِس عارضی قیام کے بعد ان پر بورڈنگ ہاؤس کا خوف کم ہو جاتا تھا۔

ایک دن ہمارے اسکول کی ہاکی ٹیم نے کسی دوسرے شہر میں میچ کھیلنے کے لیے جانا تھا۔ اور پروگرام کچھ یوں مرتب ہوا تھا کہ ہماری ٹیم کے کھلاڑی میچ کھیلنے کے بعد واپسی پر بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہریں گے۔

اگلی شام شہر میں متحرک فلم (MOVIE) دکھائی رہی تھی اور اُسے دیکھنے والوں کو بھی بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میں نے نوکر کو اپنا بستر دے کر بھیج دیا۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے امّی جان نے کہا۔

"دیکھو یوسف! تمہاری غیر حاضری کے دو دن مجھے بہت طویل محسوس ہوں گے۔ بورڈنگ میں کھانے کے پیسے دے دیا کرنا لیکن تمہارا کھانا میں خود تیار کیا کروں گی اور نوکر کے ہاتھ بھیج دیا کروں گی۔"

مجھے رخصت کرتے ہوئے ہمیشہ امی جان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتی تھیں۔

گاؤں میں میرے ساتھ کھیلنے والے کسی طالب علم کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں دو دن غیر حاضر رہوں گا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا تو انھوں نے کانفرنس بلا لی اور اس کانفرنس میں جو فیصلہ ہوا، اُس کی عملی صورت یہ تھی۔

میں میچ کھیلنے سے اگلے روز کلاس روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ حساب کے ماسٹر صاحب بلیک بورڈ پر ایک سوال حل کر رہے تھے کہ گاؤں کے چھ سات لڑکے سہمے سہمے اور شرماتے شرماتے

اسکول کے صحن میں وارد ہوئے، ہرنام سنگھ اُن کا لیڈر بنا ہوا تھا اور پیش پیش تھا۔ وہ کسی کمرے کے اندر جھانکتا اور پھر مڑ کر اپنے ساتھیوں کو اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتا اور اگلے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ سامنے برآمدے میں چلمن پڑی ہوئی تھی اور ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب بڑی دلچسپی سے چلمن کی اوٹ سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ہرنام سنگھ کے پیچھے لڑکوں کی ٹولی میں بوہڑ مسیح جو سب لڑکوں سے زیادہ تنومند اور مضبوط تھا۔ کوئی ایک مَن گنّے اپنے کاندھے پر اُٹھائے ہوئے تھا۔ ہرنام سنگھ ہمارے کلاس رُوم کے باہر آ کر رُک گیا۔ اُس نے باقی لڑکوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ پھر انھوں نے بوہڑ مسیح کو ہاتھ سے کچھ اشارے کیے۔ بوہڑ مسیح جھجکا لیکن ایک لڑکے نے اُس کا بازو پکڑ کر اندر دھکیل دیا۔ بوہڑ مسیح نے آگے بڑھ کر گنّوں کا گٹھا ایک ڈیسک پر دے مارا۔ ساتھ ہی ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا

ماسٹر صاحب نے یہ منظر دیکھا تو اُس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ دیہاتی لڑکوں نے ایسا قہقہہ نہیں سُنا تھا۔ بوہڑ مسیح بدحواس ہو کر بھاگا اور وہ اُس کے آگے بھاگ گئے۔ اُن کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ آناً فاناً نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر اور چند دوسرے اُستاد اُن کے پیچھے پیچھے چند قدم گئے پھر انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ یوسف کے گاؤں کے لڑکے ہیں بھائی! یہ بہت بڑی بات ہے کہ وہ تمہارے لیے اِتنی دُور سے تحفہ لے کر آئے تھے اور تم نے اُن کی پذیرائی اور تواضع کرنے کی بجائے انھیں بھگا دیا ہے"

"جناب مَیں نے انھیں نہیں بھگایا"

ہیڈ ماسٹر صاحب طبعاً بہت نیک نفس تھے۔ وہ مسکرائے اور کہا "ارے تم پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے انھیں نہیں بلایا۔ اب گاؤں میں جا کر ان کے ساتھ لڑائی نہ کرنا۔

یہ لوگ بہت مخلص ہیں اور تمہارے بہی خواہ ہیں" میں نے کہا۔ "سر اگر آپ یہ سمجھتے

ہیں کہ یہ کوئی بُرائی نہیں تو مَیں ان سے لڑائی نہیں کروں گا۔ لیکن سَر ان گنوں کے گٹھے کا کیا کیا جائے ؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔ "جتنے چوس سکتے ہو اپنے پاس رکھ لو۔ باقی اپنے دوستوں میں تقسیم کر دو۔"

"بہت اچھا سَر!" مَیں نے کہا۔

چھٹی کے بعد مَیں نے آٹھ دس بہترین گنے چھانٹ کر الگ کر لیے اور باقی کچھ اپنے استادوں اور کچھ اپنے شہری ہم جماعتوں میں تقسیم کر دیئے۔ کیونکہ دیہاتی لڑکوں کے لیے یہ کوئی قابل قدر تحفہ نہیں تھا۔

پھر مَیں نے بہترین آٹھ دس بچے ہوئے گنے اٹھائے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے ان کا نام شیر الدین تھا۔ جب نوکر نے میری اطلاع دی تو انہوں نے فوراً بلا لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر گنے پیش کر دیئے۔ "جناب یہ لیجیے! آپ نے کہا تھا کہ میں یہ گنے اپنے دوستوں میں تقسیم کر دوں۔ یہ ان میں سے بہترین گنے ہیں جنھیں مَیں نے چھانٹ کر الگ کر لیا تھا۔ اور مجھے کچھ دیر یہ سوچنا پڑا کہ یہاں میرا بہترین دوست کون ہے ؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب کے اشارے سے گنے نوکر نے پکڑ لئے اور وہ بولے: "یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم مجھے اپنا "دوست" سمجھتے ہو۔ اب تم اندر جاؤ اور میرے کمرے کی دوسری الماری سے کوئی دلچسپ کتاب پڑھنے کے لیے نکال لو اور مطالعہ کرنے کے بعد لا کر خود ہی وہ کتاب اس الماری میں رکھ دینا اور دوسری لے جانا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب پہلے ہی میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور دلچسپ اور نصیحت آموز کہانیاں جو مجھے اُن کے گھر سے ملتی تھیں۔ میں نے اُن سے پُورا فائدہ اُٹھایا تھا۔

چند دن بعد ابا جان گاڑی سے اترے تو ریلوے اسٹیشن پر اُن کی ملاقات ماسٹر جگن ناتھ سے ہو گئی۔

ابا جان ہر اُستاد کا احترام کرتے تھے، اِس لیے وہ ماسٹر صاحب کے لیے رُک گئے۔ ماسٹر صاحب نے گفتگو کا آغاز ہی کچھ اس طرح کیا۔

جناب! آپ کا لڑکا ابھی سے چوہدری بن گیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ گاؤں میں اُس کے ساتھ کھیلنے والے لڑکوں کی ٹولیاں بے دھڑک اسکول میں آگھستی ہیں ایک دن آوارہ لڑکوں نے کلاس روم میں جا کر اُس کے سامنے گنوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔"

ابا جان نے گھر پہنچتے ہی مجھے بُلایا اور کہا۔

"یوسف بیٹا! کل تم بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو جاؤ گے اور وہاں گاؤں کے کسی لڑکے کو تم سے ملنے کی اجازت نہیں ہو گی۔" یہ حکم انہوں نے کچھ اس طرح تحکمانہ انداز سے دیا ـــــ کہ کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ شام تک کھُسر پھُسر ہوتی رہی۔ پھر میری حمایت میں آوازیں اُٹھنے لگیں۔ اور دادی جان بہت غصے میں آگئیں تو ابا جان نے سب کو اطمینان سے سمجھایا کہ میں یہ سب کچھ یوسف کی بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں اُس کا کافی وقت ضائع ہو جاتا ہے اور اگر اُس کا ماحول تبدیل نہ کیا گیا تو ان لڑکوں جیسا ہو جائے گا جو اس کا وقت ضائع کرنے کے لیے اسکول میں بھی جا گھستے ہیں۔

اب تک میں نے اس حادثے کا کسی سے ذکر نہیں کیا ہوا تھا۔ اِس لیے میرے حق میں کوئی آواز نہ اُٹھ سکی۔"

اگلی صبح ابا جی میرے ساتھ اسکول تشریف لے گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اور دوسرے انتظامیہ کے افراد سے ملے اور پھر مجھے ہوسٹل میں داخل کروا دیا۔ اُس روز مجھے چھٹی کے بعد گھر آنے کی اجازت مل گئی لیکن اگلے دن مجھے اپنے سامان و اسباب کے ساتھ ہوسٹل میں منتقل ہونا پڑا۔

بورڈنگ ہاؤس کے وسیع اور کشادہ ہال میں چارپائیوں کی دو قطاریں تھیں۔ اباجی خود مجھے بورڈنگ ہاؤس میں چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ ہال میں وہ ہمارے ساتھ آئے اور بولے "اب تم اپنی پسند کی جگہ بستر جمالو"۔ میں نے بورڈنگ ہاؤس کی شمال کی طرف ایک کھڑکی کے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جناب! وہ چارپائی خالی پڑی ہے اجازت ہو تو میں اپنا بستر وہاں لگا لوں؟" اباجی نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! مجھے معلوم تھا کہ تم وہ جگہ پسند کرو گے جہاں سے پہاڑ نظر آتے ہوں۔ اب دل لگا کر پڑھا کرو۔ اگر تم نے اچھے نمبر حاصل کیے اور اچھی پوزیشن لی تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں ان پہاڑوں کی سیر کرا دوں"۔

میں نے جواب دیا "اباجی! میں بہت اچھے نمبر لوں گا۔ لیکن میں آپ سے ایک بات کی اجازت لینا چاہتا ہوں"۔

"کیا بات ہے وہ؟"

"اباجان! جس دن امی جان مجھے نہ دیکھیں تو وہ بہت بے چین ہو جاتی ہیں"

"ہاں! مجھے معلوم ہے!"

انہوں نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن وہ تمہارے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں نہیں آسکتیں"۔

"اباجان! میرا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں بھاگ کر چند منٹ کے لیے انہیں دیکھ آیا کروں۔ دادی جان بھی خوش ہو جایا کریں گی"۔

اباجان نے کہا۔ "اگر تم بھاگ سکو۔ تو دونوں وقت جا سکتے ہو۔ اس سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی اور ٹانگیں مضبوط ہوں گی۔ میں تمہارے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو یہ کہہ دوں گا لیکن سکول میں بروقت حاضر ہونا اور بورڈنگ ہاؤس میں مطالعہ کے وقت

موجود رہنا تمہاری پہلی ذمہ داری ہوگی۔

تمہیں گھر جانے کی اجازت دینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاؤ اور وقت ضائع کرو"

اسکول سے چھٹی ہوئی تو میں ایک منٹ ضائع کیے بغیر ہوسٹل گیا۔ وہاں میں نے اپنی کتابیں رکھیں اور پھر گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔

امی جان! چھت کے اوپر موہڑے پر بیٹھی ہوئی تھیں میں نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر پیچھے سے دونوں ہاتھ اُن کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ انہوں نے پیار سے میری کلائیاں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو شاید یوسف کی خوشبو آرہی ہے"۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ کو اباجی نے بتایا ہوگا۔ کہ میں آؤں گا"۔

امی جان نے باری باری میرے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

"وہ یہ کہتے تھے کہ تم کبھی کبھی مجھے دیکھنے کے لیے آجایا کرو گے لیکن مجھے یقین تھا کہ تم آج ضرور آؤ گے۔ میں چھت پر تمہارا راستہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اور یہ سوچ رہی تھی کہ اُدھر مغرب کی جانب جو چند درخت ہیں وہ کٹوا دیے جائیں تاکہ میں تمہیں دور سے آتا ہوا دیکھ سکوں"۔

"امی جان!" میں نے جواب دیا۔ "اب آپ کو کبھی میرا راستہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جب آپ کے دل میں میری یاد آیا کرے گی تو میں یہاں پہنچ جایا کروں گا"۔

امی جان نے دونوں ہاتھوں سے میرے کان پکڑتے ہوئے کہا "بے وقوف! تمہیں معلوم نہیں کہ میرا دل کبھی بھی تمہاری یاد سے خالی نہیں ہوتا"۔

"امی جان! میں نے اباجان سے یہاں آنے جانے کی اجازت لے لی ہے۔ اب میں

صبح و شام آپ کے پاس آیا کروں گا۔"

"نہیں بیٹا! تم تھک جایا کرو گے"۔ امی جان نے کہا۔

"امی جان"! میں نے جواب دیا۔" آپ کو دیکھنے کے لیے میں کئی میل بھاگ سکتا ہوں۔

نماز مغرب کے بعد میں گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ کھانے پر بیٹھا تو معلوم ہوا کہ امی جان کی نسبت ابا جان کو اس بات کا زیادہ یقین تھا کہ میں شام کو چھٹی ہوتے ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔

اُس دن وہ کھانے خاص طور پر دستر خوان پر موجود تھے جو میں بڑے شوق سے کھایا کرتا تھا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو امی جان نے کچھ دودھ اور مکھن دے دیا۔ اچانک ابا جی کے دل میں کوئی خیال آیا تو انہوں نے کہا" یوسف! تم نے آج اپنی گھوڑی کی طرف توجہ نہیں دی"۔

"نہیں! ابا جان! میں صرف چھٹی کے دن اُسے دیکھا کروں گا"۔

"تمہیں معلوم ہے کہ اگر باقاعدہ توجہ نہ دی جائے تو گھوڑی کی حالت خراب ہو جاتی ہے"۔

"مجھے معلوم ہے لیکن ......"! ابا جی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارا چچا عبدالکریم اس گھوڑی پر سواری کر سکتا ہے"۔

"ہاں ابا جان!"

"پھر بیٹا! میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم صبح کے وقت تو پیدل یہاں آیا کرو گے لیکن شام کے وقت عبدالکریم تمہارے ساتھ بیٹھ جایا کرے گا اور تمہیں بورڈنگ ہاؤس تک پہنچا کر واپس آجایا کرے گا۔ اور جب فرصت ہوا کرے گی تو کبھی کبھی صبح کے وقت بھی وہ تمہیں گھوڑی پر پہنچا دیا کرے گا۔ میرا مطلب یہ ہے سواری تم کیا کرو گے اور وہ گھوڑی واپس لانے کے لیے تمہارے پیچھے بیٹھ جایا کرے گا"۔

میرے پاس اپنے احساسات کی ترجمانی کے لئے کوئی الفاظ نہ تھے اور میں بے اختیار ابا جی سے لپٹ گیا۔

انندرام اسکول میں مجھ سے ایک جماعت آگے تھا۔ وہ بورڈنگ ہاؤس میں میرے نام سے چڑتا تھا۔ اُس کا رنگ سیاہی مائل تھا، منہ پر چیچک کے داغ تھے، ماتھا حد سے زیادہ چھوٹا تھا اور آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ چوٹی کافی لمبی اور موٹی تھی اور اُسے نمایاں کرنے کے لیے باقاعدگی سے سر منڈوایا کرتا تھا۔ ہاتھ چھوٹے چھوٹے تھے۔

ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ پادری آئیزک کے ساتھ اُس کے گہرے مراسم تھے۔ پادری ایک سادہ دل آدمی تھا اور اُسے یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہوسٹل کے اندر اُس کی نظروں سے بالا بالا کیا ہو رہا ہے؟ اور انندرام اُس کی یہ ضرورت پوری کیا کرتا تھا۔ مثلاً وہ اُسے اَن دیکھے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے غیر متعلق واقعات کو اس طرح جوڑ دیا کرتا تھا کہ پادری صاحب کی نیند خراب ہو جایا کرتی تھی اور پادری صاحب نیند خراب کرنے والے کے شکر گزار ہوا کرتے تھے۔

انندرام کی انتہائی کامیابی یہ تھی کہ اُس نے ہوسٹل کے دو لڑکوں کو چھ چھ بید لگوا دیے تھے اور بہادر سنگھ پر یہ الزام لگا کر اُس کے کان پکڑوا دیے تھے کہ اُس نے اپنی الماری میں شراب کی بوتل چھپا رکھی تھی اور وہ ہر روز پیتا تھا۔ بہادر سنگھ نے کوئی صفائی پیش کیے بغیر کان پکڑ لیے اور جب پادری صاحب نے غصے میں آکر دو تین چھڑیاں مار دیں تو اُس نے احتجاج کیا۔

"جناب! مجھے یہ تو بتائیے کہ آپ کو غصہ کیوں آرہا ہے؟"

"اے اُلّو! تم شراب کی بوتلیں لے کر ہوسٹل میں آجاؤ اور مجھے غصہ نہ آئے تم پیو اور بڑھکیں مارو اور میں پھر بھی خاموش رہوں"۔

بہادر سنگھ نے عاجزی سے کہا۔" مجھے بھگوان کی سوگند! میں نے بالکل نہیں پی،

میں نے کبھی بوتلیں نہیں ماریں اور میرے پاس ایسی کوئی بوتل نہیں جس میں شراب ہو۔"

پادری صاحب نے جھنجھلا کر کہا کیا بکتے ہو؟ تمہاری الماری میں شراب کی بوتل نہیں ہے؟

"جناب! شراب کی بوتل تو ہے لیکن اُس میں اب سرسوں کا تیل ہے اور وہ اُس میں اُس وقت ڈالا گیا تھا۔ جب وہ خالی ہو گئی تھی۔"

پادری صاحب چکرا گئے انہوں نے الماری کھلوا کر خود تلاشی کر لی۔ بوتل نکالی گئی، تو معلوم ہوا کہ اُس میں خالص سرسوں کا تیل ہے، عین اُس موقع پر ہیڈ ماسٹر اور منیجر صاحب گشت پر آ گئے اور انہیں جب اس واقعہ کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ پادری صاحب کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ پادری صاحب کسی اور جگہ تبدیل کر دیے گئے ہیں اور ایک اور اُستاد جن کا درجہ سیکنڈ ماسٹر کے برابر تھا بورڈنگ ہاؤس کے نئے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے انچارج بنا دیے گئے۔ اُن کی شہرت ان کے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ ایم اے ہیں اور اُن کا نام مسٹر جسٹن ہے وہ کچھ عرصہ اسکول میں کام کریں گے اس کے بعد ملک سے باہر انہیں کوئی بڑی ملازمت مل جائے گی۔ مسٹر جسٹن کی ایک بات جس سے ہر طالب علم کو دلچسپی تھی۔ وہ یہ تھی کہ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ اور اس معاملے میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ مسٹر جسٹن آئے اور انہوں نے بورڈنگ کے لڑکوں کو جمع کیا اور پہلی ملاقات میں یہ الفاظ کہہ دیے کہ میں اچھے لڑکوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرتا ہوں اور بُرے لڑکوں کو کبھی یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ سزا سے بچ سکیں گے۔

تیسرے دن مسٹر جسٹن نے پھر طلباء کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ اُن کے ہاتھ میں بید تھا، اور لڑکے اُن کے تیور دیکھ کر یہ سمجھ سکتے تھے کہ آج کسی کی شامت آئی ہوئی ہے۔

چند ثانیے بعد انہوں نے کہا۔ "جب سے مَیں یہاں آیا ہوں ایک لڑکا میرے پاس تین چار بار آیا ہے پہلے وہ صرف سلام کرتا تھا شاید اس لیے کہ مجھے دو تین بار سلام کیا جائے،

تو مَیں بے وقوف بن جاتا ہوں اور پھر اُس نے ایک اور لڑکے کی شکایات لگانا شروع کر دیں۔ شاید تم سمجھ گئے ہو گے۔ وہ لڑکا کون ہے؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ آگے آ کر کھڑا ہو جائے۔"

جب کوئی لڑکا نہ اُٹھا تو مسٹر جسٹن نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"انند رام آگے آ جاؤ!"

انند رام نے حکم کی تعمیل کی۔

مسٹر جسٹن نے کہا۔ "یوسف تم بھی آگے آ جاؤ۔"

مَیں اُٹھ کر چند قدم آگے بڑھا۔

مسٹر جسٹن نے انند رام کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"دیکھو! بے وقوف لڑکے تمہارے لیے صحیح جواب دینے کا آخری موقع ہے، ورنہ تمہیں وہ سزا ملے گی جو تمہیں عمر بھر یاد رہے گی۔"

"اب بتاؤ کیا تم نے یوسف پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اپنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھٹی ہوتے ہی بھاگ جاتا ہے اور اس لیے بھاگ جاتا ہے کہ گاؤں کے آوارہ لڑکے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں آتے ہوئے ڈرتے ہیں؟"

"جی! میں نے کہا تھا۔" انند رام نے کہا۔

"تم نے یہ الزام بھی لگایا تھا کہ یہ علی الصباح گاؤں کی طرف بھاگ جاتا ہے؟"

"جی! مَیں نے کہا تھا۔"

"یوسف! اب تم جواب دو۔ کہ چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے؟"

"جی! چھٹی چار بجے ہوتی ہے۔" "اور تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟"

"جناب! دو میل سے کم ہے۔" "اور واپس کتنے بجے آ جاتے ہو؟"

"جناب! مَیں مطالعہ شروع ہو جانے سے پہلے آ جاتا ہوں۔"

"تم گھر جا کر کھانا کھاتے ہو۔"

"جی ہاں"! "دو مرتبہ گھر جانے کی کوئی خاص وجہ بتا سکتے ہو؟"

"جی! اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امّی جان مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ کھانا نہ کھاؤں تو وُہ بھوکی رہتی ہیں۔"

"تمہارے اور بہن بھائی بھی ہیں۔"

"جی ہاں! میں اِس لیے بھی گاؤں جاتا ہوں کہ انہیں دیکھ کر مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

"تمہیں گھر میں کھانا کھانے اور باتیں کرنے کا اِتنا وقت مِل جاتا ہے کہ تم کھانا بھی کھا سکو، اور باتیں بھی کر سکو۔"

"جی! واپسی میں اپنی گھوڑی پر آتا ہوں اور میرے ساتھ ایک آدمی ہوتا ہے۔ جو اُسے واپس گاؤں لے جاتا ہے۔"

ماسٹر جسٹن نے انندرام کی طرف دیکھا۔

"کیوں انندرام! اب بتاؤ! کیا یوسف نے کوئی بات غلط کہی ہے؟"

"جی نہیں!"

"کوئی ایسی بات ہے جو یوسف نے نہیں بتائی؟"

"جی نہیں؟"

"کوئی ایسی بات ہے جس پر تمہیں کوئی اعتراض ہو؟

ہاں مجھے یاد آیا تم نے یہ کہا تھا کہ یوسف اپنے گاؤں سے گنّے اور گُڑ منگواتا ہے اور لڑکوں میں تقسیم کرتا ہے۔ کیا تمہیں بھی اس نے کبھی گنّا اور گُڑ دیا؟"

"جی! مجھے اِس نے گنّے بھی دیے تھے اور گُڑ بھی دیا تھا۔"

"مُفت دیا تھا یا تم سے پیسے لیے تھے؟"

انندرام نے کہا" سَر میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ کسی سے پیسے لیتا ہے۔"

"تو پھر تمہیں کیا شکایت ہے؟"

"سر اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے تو مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

"یوسف تم اِس بے وقوف لڑکے کے مُنہ پر ایک تھپڑ مارنا پسند کرو گے یا زیادہ؟"

یوسف نے جواب دیا۔"نہیں سر! میں اس کے منہ پر تھپڑ مارنا پسند نہیں کرتا۔"

"اِس کے باوجود تم اس کے منہ پر تھپڑ مارنا پسند نہیں کرتے کہ اس نے تمہارے خلاف شکایتیں کی ہیں؟"

"سَر یہ بے وقوف ہے۔ میرے تھپڑ کھا کر عقل مند نہیں ہو جائے گا۔"

مسٹر جسٹن نے کہا۔

"دیکھو انندرام! میں اِس دفعہ تمہیں معاف کرتا ہوں لیکن آئندہ اگر تم نے کوئی حماقت کی تو اس بید سے تمہاری خوب تواضع کی جائے گی۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

"ہم سٹڈی روم سے باہر نکلے تو انندرام کے خلاف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کئی لڑکے اس بات پر ناراض تھے کہ میں نے اسے تھپڑ کیوں نہیں مارا۔

باب ۔ ۱۹

ہمارے ایک رشتہ دار اپنے دَور کے ایک مشہور عالم دین تھے۔ انہیں طب کا شوق بھی تھا اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دُور دراز کے مقامات کی سیاحت بھی کیا کرتے تھے۔ بڑے مشہور خطیب تھے اور جہاں جاتے تھے اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کشمیر کی سیاحت کے بعد واپس آتے وہاں سے کسی عقیدت مند نے انہیں ایک سواری کا جانور جسے وہ "یارقندی گھوڑا" کہہ کر اپنے مریدوں کو مرعوب کر دیا کرتے تھے۔ تحفے کے طور پر دیا۔ طویل مسافت میں بُھوکا رہنے کی وجہ سے اُس کی حالت قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ قد اتنا چھوٹا تھا کہ مولانا جب چغہ پہن کر اُس پر سوار ہوتے تھے تو اُسے صرف قریب سے دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ گھوڑے کی نسل سے ہے۔ گردن بہت چھوٹی تھی۔ اُس کے جبڑے قد کی نسبت زیادہ مضبوط اور بھاری معلوم ہوتے تھے۔ آنکھوں سے عیاری ٹپکتی تھی۔

مولوی صاحب کے زورِ خطابت کے باعث سُننے والوں کو اُن کے اَن گنت اوصاف نظر آ جاتے تھے، جب وہ یہ کہتے تھے کہ یہ تنگ اور پُرپیچ پہاڑی راستوں پر بے دھڑک چڑھ جاتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے کشمیر کے پہاڑوں میں بھاگتے اور کُودتے دیکھ

رہے ہیں۔ چوہدری غلام نبی کو مولوی صاحب سے کچھ زیادہ ہی اُنس تھا۔ اُس نے برادری کے دوسرے بزرگوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد مولوی صاحب سے درخواست کی کہ اگر یہ نسل واقعی بہت قیمتی ہے تو اسے ہمارے پاس چھوڑ دیجئے۔ یہاں اسے ہمارے لہلہاتے کھیتوں میں کھلے بندوں پھرنے کی آزادی ہوگی اور دو تین مہینے جب یہ آزادی سے گندم کے کھیتوں میں گھومے پھرے گا، تو اس کی شکل تبدیل ہو جائے گی۔ قد و قامت اِس کا شاید زیادہ نہ بڑھ سکے لیکن جسامت میں دوگنا ضرور ہو جائے گا۔

مولانا نے خوش ہو کر کہا: "تو غلام نبی اب یہ گھوڑا پورا ایک سال تمہارے پاس رہے گا۔ اور اگر ایک سال یہ آزادی سے سرسبز کھیتوں میں پھرتا رہا تو پھر کوئی سوار اِس کے قریب نہیں جا سکے گا"۔

مولانا تو پھر کسی دُور دراز سفر پر چلے گئے۔ دیہاتی لوگوں نے یارقندی گھوڑے کو پہلے انگوٹھا ــــ پھر انگوٹھ ــــ اور بالآخر گوٹھ کہنا شروع کر دیا۔ اُس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ چند ماہ بعد گوٹھ کا لفظ کتنا مشہور ہو جائے گا۔

اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ تمہارے دل میں کب سواری کا شوق پیدا ہوا تھا؟ اور تم نے کس سے سواری سیکھی تھی تو میں اس کا صحیح جواب نہ دے سکوں گا۔

گھر کا ہر بڑا ــــــ اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا تھا۔

جب مَیں پرائمری سکول میں پڑھتا تھا، مجھے کسی چھوٹے قد کے ٹٹو کی پُشت پر کُودتے ہوئے خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ جب قبلہ مولوی صاحب کا "یارقندی گھوڑا" جو گاؤں میں گوٹھ کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ ہمارے گاؤں میں آیا تو میں ایک اچھا خاصا سوار بن چکا تھا۔ اور مَیں نے گوٹھ کی تعریف سُننے کے بعد اپنے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ جب یہ خوب مضبوط اور توانا ہو جائے گا تو سب سے پہلے میں اس پر سواری کروں گا۔

اور جب وہ گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں آزادی سے گھومتا پھرتا تو میں خوش ہوا کرتا۔
مَیں نے اُس کے ساتھ "دوستانہ مراسم" پیدا کرنے کے لیے اُسے گڑ کھلانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ کسی کو قریب نہیں آنے دیتا تھا اور غلام نبی کہا کرتا تھا۔
"یار یہ تو بالکل جنگلی ہوتا جا رہا ہے"!

سردیوں کے دنوں میں گوٹھ رات کے وقت "مویشیوں کے باڑے" میں آجاتا تھا جب موسم بہار آیا تو اُس کی جسامت میں ناقابلِ یقین اضافہ ہو چکا تھا۔ گردن موٹی ہو جانے کے باعث اور چھوٹی نظر آتی تھی۔ گوٹھ چلتی ہوا میں دوڑتا تھا تو اُس کے لہراتے ہوئے بال دُور سے نظر آتے تھے۔ اُس کے گلے میں رسّہ ڈال کر کسی جگہ باندھنا ایک مسئلہ تھا اس کے لیے گاؤں کے مضبوط آدمیوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور اسے باڑے کے ایک کونے میں شہتوت کے ایک درخت کے نیچے باندھ دیا جاتا تھا۔

ایک دن جب نوکر نے اُسے لگام دینے کی کوشش کی تو اُس نے اگلے سُم اٹھا لیے اور نوکر اُس کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ چوہدری غلام نبی نے مجھے آواز دی اور کہا "بھئی! یہ تو لگام دیکھ کر حملہ کرتا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟"

مَیں نے نوکر سے کہا۔ تم رسّا کھونٹے سے کھول کر درخت کی شاخ کے اُوپر ڈال دو۔ اور پھر رسّے کو اِتنا کھینچو کہ گھوڑا ہل جُل نہ سکے۔ البتہ اس کی گردن اُوپر اٹھ جائے۔

اب چونکہ گھوڑے کی گردن اِتنی اُوپر ہو چکی تھی کہ اُس کے لیے اُچھلنے کُودنے کی گنجائش نہ تھی۔ اِس لیے مَیں نے اس کا جبڑا پکڑا اور غلام نبی نے اُس کے منہ میں لگام ٹھونس دی۔

مَیں نے کہا۔ "چچا! جلدی کرو زین منگواؤ پھر یہ قابو میں نہیں آئے گا"۔
نوکر بھاگ کر زین لایا۔ گھوڑا اُسے دیکھ کر تڑپا، اُچھلا، ایک دو بار ہولناک سی آواز نکالی لیکن اُس کے بعد بے بس ہو گیا۔

غلام نبی نے اُسے کھولنے سے پہلے احتیاطاً دو آدمی اور بلوا لیئے تھے میں لپک کر بید کی مضبوط چھڑی جسے میں سرکش گھوڑوں پر استعمال کیا کرتا تھا، لے آیا۔ تڑپتے، اُچھلتے کودتے گھوڑے کو باڑے سے اِس طرح نکالا گیا کہ دو مضبوط آدمی اُس کی لگام تھامے ہوئے تھے اور دو نے اُس کا رسّہ پکڑ رکھا تھا جب وہ گیٹ پر پہنچا تو رسّہ اس کی گردن سے لپیٹ کر باندھ دیا گیا۔

ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ سواری کون کرے گا۔ مَیں نے آواز دی چچا غلام نبی! میں آ رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی مَیں نے دوڑ کر چھلانگ لگا دی اور زین پر بیٹھ کر نوکروں کے ہاتھ سے لگام چھین لی۔

گوٹھ تڑپا، اُچھلا، کبھی وہ اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی پچھلی ٹانگیں اُوپر کر کے ہوا میں دولتیاں جھاڑتا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے اور غلام نبی کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

لیکن گھوڑے کو زیادہ دیر اپنے کرتب دکھانے کا موقعہ نہ ملا۔ مَیں نے رکابوں کے اندر پاؤں جماتے ہی، اُس کی پیٹھ پر یکے بعد دیگرے دو چھڑیاں رسید کیں۔ وہ اُچھلا، رکا، اور پھر ایک طرف بھاگ نکلا۔ اب وہ بھاگ رہا تھا اور میں اُسے خوب دوڑا رہا تھا۔ مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ یارقندی نسل کے ناطے سے میں نے جو اُس کی خوبیاں سنی تھیں وہ بے وجہ نہیں تھیں۔ اُس کا بار بار راستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھٹکنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن میں اُس کی گردن پر چھڑی مار کر اُسے خبردار کر دیتا تھا۔ وہ راستہ بھی درست کر لیتا تھا اور نسبتاً رفتار بھی تیز کر دیتا تھا۔

گاؤں کے کچھ لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے میرے پیچھے سوار ہو کر نکلے تھے لیکن وہ بہت پیچھے رہ گئے۔ میں چند منٹ کے بعد بڑی نہر کے کنارے پہنچ کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب گوٹھ تھک چکا ہو گا۔ اُسے پٹڑی پر آرام سے چلنے دوں گا لیکن پٹڑی پر چڑھتے

ہی گوٹھ نے اچانک ایک جست لگائی اور مجھے نہر کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ کھانا پڑا۔ اگر میں تیراک نہ ہوتا تو یار قندی حضرت مجھ سے انتقام لے چکے تھے لیکن میں تیزی سے دو چار ہاتھ مارنے کے بعد باہر نکل آیا۔ اب گوٹھ کی باری تھی۔

پانی کافی گہرا تھا اور گوٹھ کے باہر نکلنے کی یہی صورت تھی کہ کنارے پر اس کے پاؤں کسی جگہ جم جائیں لیکن ایسی جگہ وہاں نہیں تھی۔ میں اُسے چھڑی سے ڈرا کر پیچھے کر دیتا بخت سرد پانی میں اُس کی تمام شوخیاں بہت جلد ختم ہو چکی تھیں۔ عام حالات میں مجھے یہ خوف ہونا چاہیے تھا کہ اگر میں ایک بار گر پڑا تو مجھے اس پر سوار کون کرائے گا لیکن وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ دغا باز آنکھوں سے مسکینی اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔ میں نے ایک موزوں جگہ دیکھ کر اُس کی لگام پکڑ کر کھینچی اور وہ کنارے پر چڑھ آیا۔

میں نے اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ وہ نتھنوں سے ایک ایسی آواز نکال رہا تھا جس میں غصے کی بجائے التجا تھی۔

میں اُس کی لگام پکڑ کر پیدل چل پڑا اور وہ میرے ساتھ آرام سے چلتا رہا۔ پھر میں اُس پر سوار ہونے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ وہ گوٹھ نہیں، بلکہ جانوروں کی ایک انتہائی بے ضرر نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

یہاں سے ہماری واقفیت شروع ہوئی گوٹھ مجھے پہچاننے لگ گیا تھا لیکن کبھی کبھی وہ آنکھیں پھیر لیا کرتا تھا اور شاید اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

میں نے میٹرک پاس کیا تو ابا جان میرے لیے ایک خوب صورت گھوڑی خرید لاتے تھے اور میں اس سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ مجھے سواری کے کسی اور جانور پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

○

سردیوں کے دنوں میں ہمارے ایک رشتہ دار ہمارے یہاں آئے وہ چند دن ٹھہرے،

اُن کے پاس بھی ایک گھوڑی تھی وہ میری گھوڑی کے ساتھ بہت مانوس ہو گئی۔ ایک دوپہر وہ رخصت ہوتے تو باہر کھیتوں میں میری گھوڑی چر چگ رہی تھی، وہ مہمان کی گھوڑی کے پیچھے چل پڑی۔ سہ پہر کا وقت تھا —— مجھے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ ایک آدمی گھوڑی پر سوار جا رہا تھا اور آپ کی گھوڑی اُس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی میری گھوڑی اپنی نئی دوست کے ساتھ اتنی مانوس ہو چکی تھی کہ اس بات پر مجھے تعجب نہ ہوا۔

اب کئی مہینوں کے بعد گوٹھ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ گوٹھ میرا اتنا لحاظ ضرور کرتا تھا کہ اُس پر سوار ہونے کے مراحل خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں۔ میں اُس گاؤں کی طرف چل پڑا جو کوئی سات آٹھ میل دور تھا۔ چونکہ رات سر پہ آ رہی تھی اس لیے میں کافی تیز دوڑا رہا تھا۔

میرا راستہ ایک نہر کی پٹڑی پر کوئی تین چار فرلانگ چلنے کے بعد اُس پل پر پہنچ جاتا تھا۔ جس کے پار جا کر مجھے اس گاؤں کا راستہ ملتا تھا۔

مغرب کے وقت میں کسی دقت کے بغیر اُس گاؤں میں پہنچ گیا۔ وہاں ہمارے رشتہ دار اور گاؤں کے دوسرے لوگ دیکھتے ہی جمع ہو گئے اور انہوں نے کہا "اُس بے وقوف نے نہر کے پُل پر آ کر تمہاری گھوڑی دیکھی ہے۔ اور یہاں پہنچتے ہی گھوڑی کو دو آدمیوں کے ساتھ واپس بھیج دیا گیا ہے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ میں وہاں ٹھہر جاؤں اور تسلی دی کہ گھوڑی پہنچ گئی ہوگی۔

لیکن مجھے گھوڑی سے اتنا پیار تھا کہ مجھے اطمینان نہ ہوا۔ میں نے گوٹھ کی باگ موڑی اور السلام علیکم کہہ کر اُسے ایڑ لگا دی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ پل عبور کرنے کے بعد نہر کی پٹڑی سے جو راستہ اُترتا تھا وہ میں اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ سکا۔ شاید میں دو تین فرلانگ کی بجائے ایک یا دو میل آگے نکل آیا۔

دو دن قبل کافی بارش ہو چکی تھی اور راستے میں کافی کیچڑ تھا۔ میں رات کی تاریکی

میں واپس جاکر راستہ تلاش کرنے کی بجائے نیچے اُتر پڑا۔ میں کھیتوں میں کیچڑ سے لت پت ہوچکا تھا اور تاریکی میں صرف ستاروں سے اپنی سمت متعین کرسکتا تھا۔ مجھے ایک خدشہ مزور تھا۔ کہ میں کہیں بے خبری کی حالت میں جرائم پیشہ قبیلے کی بستیوں میں نہ پہنچ جاؤں۔ یہ آٹھ دس گاؤں ایسے تھے جن کے آدمیوں کو علاقے کے تھانے میں حاضری دینی پڑتی تھی۔ اُن کی زمینیں اتنی اچھی نہیں تھیں۔ اِس لیے نقب زنی، رسّہ گیری اور چھوٹے چھوٹے ڈاکوں پر وُہ لوگ گذارہ کرتے تھے۔ کوئی بڑی واردات ان لوگوں سے منسوب نہ تھی۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ پولیس بلاوجہ انہیں تنگ کرتی ہے۔

اب مجھے اپنے "یار قندی" دوست کے متعلق جو ایک نیا تجربہ ہُوا، وہ یہ تھا کہ وُہ تاریکی میں بھاگتا ہُوا اچانک ایک جوہڑ میں کُود پڑا۔ میں نے یکے بعد دیگرے اُسے دو تین چھڑیاں ماریں، وہ کُودا اور چھلانگ لگاکر باہر نکلا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک عورت چولہے پر روٹیاں پکارہی ہے۔ یعنی میں ان جرائم پیشہ لوگوں کی بستی میں نہیں بلکہ کسی کے گھر جا پہنچا تھا۔ بھائی کون ہے؟ بھائی کون ہے؟ عورت چلائی۔

میں نے جواب دینے کی بجائے گوڑھ کو دو چھڑیاں رسید کیں اور چھوٹی سی گلی سے نکل کر پھر کسی کھیت میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد کئی طرف سے آوازیں آرہی تھیں "اے کون ہے؟ تم اِدھر سے جاؤ دیکھو کون ہے؟ ہم اُدھر سے جاتے ہیں۔ اگلے گاؤں کو خبردار کرو۔ ہم سے پُوچھے بغیر یہاں کون آگیا ہے"۔

پھر کئی عورتیں بول رہی تھیں اور میں نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں

اب میری کوشش یہ تھی کہ ان آوازوں سے دُور چلا جاؤں۔ میں زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ دوسری طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"یار اُدھر سے آوازیں آرہی ہیں کہ کوئی گروہ اِدھر سے آیا ہے"۔

میں نے گوڑھ کو روک لیا اور اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دو آدمی بھاگتے ہوئے آئے۔

یار! اِدھر تو کوئی نہیں۔ اُن میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

پھر پیچھے سے آوازیں آنے لگیں۔ "ارے! کوئی پتہ چلا؟"

یہ دو آدمی بالکل قریب آگئے تو میں نے کہا "ٹھہر جاؤ! وہ رُکے۔ تم اس وقت کہاں بھاگے پھرتے ہو؟" انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ذرا غصّے سے کہا "بیوقوف! بولتے کیوں نہیں؟ میں پوچھتا ہوں پولیس کہاں ٹھہری ہے"۔

ایک نے کہا۔ "جی پولیس اِدھر نہیں آئی ہے؟"

"اگر نہیں آئی تو لوگ بھاگے کیوں پھرتے ہیں؟"

"جی ہمیں کچھ معلوم نہیں، ہم دوسروں کا شور سُن کر آئے ہیں"۔

"ہمارے آدمی پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگر تم بتادو کہ کارخانے کی بتیاں کس طرف ہیں تو میں ابھی راستہ تلاش کرکے انہیں ڈھونڈ لوں گا"۔

دیہاتی نے کہا۔ "جناب کارخانے کی بتیاں اگلے گاؤں سے نکلتے ہی آپ کو نظر آجائیں گی"۔ ...

"چلئے۔ مَیں آپ کے ساتھ چلتا ہوں"۔

اچھا چلو! اور اپنے ساتھیوں سے کہہ دو کہ اگر دوسری طرف سے کوئی آئے تو وُہ یہ کہہ دیں۔ کہ غلام قادر حوالدار، تھانے دار صاحب کا راستہ دیکھنے گیا ہے۔

دوسرے آدمی نے کہا۔ "حوالدار صاحب آپ فکر نہ کریں، اگر اس علاقے میں پولیس کا کوئی آدمی آیا ہے تو اُسے بہت جلد یہ پیغام مل جائے گا"۔

"اب آپ بتیاں دیکھ کر خود راستہ تلاش کرلیں گے یا ہمارا آدمی آپ کے ساتھ کچھ دُور تک جائے"۔

"نہیں! مہربانی اس کی ضرورت نہیں"۔ مَیں نے یہ کہہ کر گوڑھ کو ایڑ لگادی۔

کوئی ایک میل چلنے کے بعد اگلے گاؤں کی دوسری طرف

مجھے کارخانے کی بتیاں دکھائی دیں۔ اب مجھے معلوم تھا کہ ان بتیوں کی سیدھ میں چلتا رہوں تو کارخانے والے شہر سے ——— دو میل اُس طرف میرا گاؤں واقع ہے۔

باب ۔ ۲۰

گاؤں کے چھوٹے اور بڑے گھروں سے باہر نکل کر میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی، بیک وقت کئی آوازیں آئیں "گھوڑی پہنچ گئی ہے۔ گھوڑی پہنچ گئی ہے" پھر انہوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے گھوڑے سے کود کر انہیں جواب دیا۔

"مجھے گھوڑی کی تلاش میں بہت دُور جانا پڑا تھا۔ اور پھر واپسی پر میں راستہ بھول گیا۔"

پھر میں نے ایک نوکر سے کہا "تم بھاگ کر جاؤ اور ہمارے گھر سے بہت سا گُڑ لے کر آؤ۔"

نوکر گُڑ کی بھیلی لے آیا تو میں نے گھوڑے کی لگام اتاری اور گُڑ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر اُسے کھلانا شروع کر دیا۔ غالباً یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اُس کے منہ کے قریب لے گیا اور اُس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اُس کے منہ میں دانت ہیں۔ میں نے تین چوتھائی بھیلی اُسے کھلا کر باڑے میں بھجوا دیا اور باقی ماندہ گُڑ اپنی گھوڑی کو کھلا دیا۔

پھر میں نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے تو باورچی خانے سے امی جان کی آواز آئی۔

"یوسف! تمہارا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "امی جان! میرا خیال تھا کہ آپ سو گئی ہوں گی۔"

"جھوٹا کہیں کا!" ماں نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جب تم آئے تھے تو میں تمہاری دادی اور تمہاری چچیاں سب گھر سے باہر نکل کر تمہارا راستہ دیکھ رہی تھیں اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری دادی اماں اس وقت شکرانے کے نوافل ادا کر رہی ہیں۔"

یوسف نے کہا۔ "امی جان! مجھے ایک بات اور معلوم ہے کہ جب میں مکان کے اندر داخل ہوا تھا۔ تو آپ میرے لیے مرغی بھون رہی تھیں۔"

ماں نے پوچھا۔ "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"امی جان! بھوک لگی ہوئی ہو، تو بھونے جانے والے گوشت کی خوشبو بہت دور سے آجاتی ہے۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹا! جو ماں سمجھ سکتی ہے وہ کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ میں نے عشاء کے وقت شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ فوراً ایک مرغی ذبح کر لی جائے اگر میرا بیٹا دیر سے آیا تو اُسے بہت بھوک لگ رہی ہو گی لیکن سب یہی کہتے تھے کہ وہ راستے میں کسی کے گھر سے کھانا کھا کر آئے گا۔ یوسف! یہ عجیب ہے کہ تمہارے متعلق جو کچھ میں سوچتی ہوں وہی درست ہوتا ہے۔"

"امی جان! آپ کے سوا اور کون ہے۔ جو میرے متعلق ایک ماں کی طرح سوچ سکتا ہے۔"

ماں نے چراغ کی روشنی میں میری طرف غور سے دیکھا اور پھر میرا سر اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے۔ اپنے ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کر دیے۔ پھر وہ بولیں! "دیکھو یوسف! مجھے نہ ستایا کرو! جب مجھے پتہ چلا کہ تم اپنی گھوڑی کی تلاش میں

چلے گئے ہو تو میرے لیے یہ لمحہ قیامت سے کم نہ تھا۔ تمہیں میرے پیار کی حقیقت اُس وقت سمجھ میں آئے گی۔ جب میں — جب میں، اُن کی آواز بھرا گئی۔ میں نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"امی جان! مجھے معاف کر دیجئے! مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کو بتا کر جانا چاہیے تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا —— آئندہ کبھی ایسا نہیں ہو گا۔"

ایک منٹ بعد جب امی جان نے کھانا میرے سامنے رکھ دیا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی جان! ایک بات اور بتاؤں۔"

"بتاؤ! بیٹا!"

"امی جان! بات یہ ہے کہ آپ بھی بھوکی ہیں"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"امی جان! جب مجھ سے کوئی ایسی حماقت ہوتی ہے تو آپ کھانا نہیں کھایا کرتیں۔"

ماں جی میرے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئیں۔

ایک ہفتہ بعد قبلہ مولوی صاحب تشریف لائے اور چند دن قیام کرنے کے بعد گوٹھ کو اپنے ساتھ لے گئے اور قریباً تین مہینے بعد دُور دراز علاقوں میں مصروف رہے اور راستے میں گھوڑا کسی خوشحال زمیندار کے پاس چھوڑ گئے۔ جو اس کی بے حد تواضع کرتا تھا۔ جب وہ واپس تشریف لائے تو گوٹھ کو غلام نبی کے پاس چھوڑ گئے۔ لیکن اتنی طویل غیر حاضری کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی دیواریں پھر حائل ہو چکی تھیں۔ گوٹھ کافی فربہ نظر آتا تھا اور چوہدری غلام نبی کے دل میں یہ حسرت ایک مدت سے تھی کہ اس میں کچھ

شائستگی پیدا کی جائے۔ وہ اِتنا مانوس ضرور ہوگیا تھا کہ اُن کے ہاتھ سے چنے اور گُڑ کھا لیتا تھا اور اس بات کی بھی اجازت دیتا تھا کہ وہ لگام دے لیں اور زین بھی ڈال لیں۔ لیکن کسی سوار کے لیے اُچھل کُود سے باز رہنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک مرتبہ غلام نبی کو لے کر وہ کماد کے کھیت میں گھُس گیا تھا اور پندرہ بیس منٹ اُسی کھیت میں بھاگتا دوڑتا رہا۔ غلام نبی نے کماد کے پتوں کی کاٹ سے اپنی آنکھیں بچالی تھیں لیکن اس کا چہرہ اور ہاتھ بُری طرح زخمی ہوگئے تھے۔

بہت کم خوش نصیب لوگ ایسے تھے جنہیں وہ اپنی روداد سنایا کرتا تھا۔

ایک دن اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"یوسف سچ بتاؤ ——— کہ تم اس پر سواری کرتے وقت کیا پڑھا کرتے ہو؟"

"چچا! میں تو کوئی خاص چیز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ البتہ ہر کام شروع کرتے وقت میں اللہ کی اعانت کی دعا کیا کرتا ہوں اور یا حفیظُ یا حفیظُ ضرور کہا کرتا ہوں۔"

غلام نبی بولا "یار! اب اس پر ایسی دعاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

"بات یہ ہے کہ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ گھوڑے کے لیے ایک اچھے سوار کا ہونا ضروری ہے۔ جو اس پر باقاعدہ سواری کرتا رہے۔ اب گوٹھ بیچارے کی بدقسمتی یہ ہے کہ چار چار مہینے اس پر سواری کوئی نہیں کرتا۔"

غلام نبی نے کہا "یار! اب اس کا رعب اتنا ہوگیا ہے کہ سب اس سے ڈرتے ہیں۔ مَیں نے سُنا ہے کہ تم بھی اُس سے ڈرتے ہو۔"

"چچا! آپ کو کس نے بتایا کہ میں اُس سے ڈرتا ہوں؟"

غلام نبی نے کہا۔ "وہ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یوسف مجھ سے ڈرتا ہے۔ البتہ گاؤں کے لوگ ضرور یہ بات کہتے ہیں۔"

"چچا جان! آپ اُن سب کو بلالیں۔ میں ابھی اُس پر سواری کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

یہ کوئی تین بجے کا وقت تھا۔ میں گوٹھ پر سوار ہوگیا۔ اُس نے حسبِ معمول اپنے سارے کرتب دکھائے لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

پھر میں نے اُسے ایک دائرے میں دوڑانا شروع کیا اور وہ آرام سے بھاگنے لگا۔

ایک کھیت کے کنارے پھلاہی کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا اور گوٹھ کو جس دائرے میں مَیں بھگا رہا تھا۔ اُسے ان خاردار جھاڑیوں کے قریب لے جانے کے لیے ذرا بڑھا دینے کی ضرورت تھی۔ دو چکر لگانے کے بعد وہ جھاڑیوں سے قریب ہوگیا۔ البتہ تیسرے چکر میں اُس نے اچانک اپنا رُخ بدل لیا اور سیدھا جھاڑیوں میں جا گھُسا اور وہ گھُسا بھی کچھ اس طرح کہ اُس نے اپنا جسم سمیٹ لیا۔ اتنا سمیٹ لیا کہ اُسے نچلی شاخوں کے نیچے کافی جگہ مل گئی۔ لیکن مجھے اپنا چہرہ بچانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے کام لینا پڑا۔ پھلاہی کے کانٹے سیدھے اور لمبے ہونے کی بجائے چھوٹے اور ٹیڑھے ہوتے ہیں اس لیے وہ جسم پر خراش تو لگا دیتے ہیں اِس سے زیادہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم یہ تھا کہ مَیں نے ہر وقت اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر اپنی آنکھیں بچالی تھیں۔ باقی زخم میرے لیے بے معنی تھے اور اِس مصیبت سے نجات حاصل کرتے ہی مَیں غلام نبی کے ساتھ دل لگا کر قہقہے لگا رہا تھا اور اس مصیبت سے دراصل میں نے نجات اس طرح حاصل کی تھی کہ گوٹھ کی لگام تو اپنے ہاتھ میں رکھی اور رکابوں سے اپنے پاؤں نکالے اور پھر رینگتا ہُوا۔ جھاڑیوں سے باہر نکل آیا۔ رینگنا گوٹھ کے بس کی بات نہ تھی اور جگہ اتنی تنگ تھی کہ اس کے لیے کھڑا ہونا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ جب وہ چھڑیاں کھانے کے بعد مجبوراً باہر نکلا تو اُس کے جسم کی خراشیں

مجھ سے کہیں زیادہ تھیں اور اُس پر اُسی قسم کا خوف طاری تھا جو میں نے پہلے تعارف میں ٹھنڈے پانی کی نہر سے بے بسی کی حالت میں نکلنے کے بعد دیکھا تھا

مَیں نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا تو اُسے اطمینان ہُوا۔ مَیں نے آواز دی "چچا غلام نبی اب آپ اطمینان سے اِس پر سواری کر سکتے ہیں۔"

غلام نبی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"نہیں بھئی! اس پر سواری کرتے ہوئے آنکھوں کی حفاظت کے لیے لوہے کے خود بنوانے پڑیں گے ...... یا سارے علاقے کے کانٹے دار درخت تلف کرنے پڑیں گے۔"

"یار! مجھے ویسے ہی چلتا پھرتا اچھا لگتا ہے۔ سواری کو گولی مارو!

"چچا! اِس کے ساتھ دوستی کرنا ہے تو اس پر روز سواری کیا کرو۔ اور اِسے اپنے ہاتھ سے گُڑ کھلایا کرو۔"

غلام نبی نے کہا۔ "دیکھو! بیٹا! یہ نہیں ہو سکتا کہ دوستی تو میری رہے لیکن سواری کی تکلیف تم کر لیا کرو؟"

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں اسلامیہ کالج لاہور پہنچ گیا۔ یہ عظیم شہر جس کی پرانی عمارتوں کی ایک ایک اینٹ پر مسلمانوں کے ماضی کی داستانیں نقش تھیں مجھے ایک طلسم کدہ معلوم ہوتا تھا۔ قدیم عمارات کو دیکھ کر میں یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ میں مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار سے گزر رہا ہوں۔ لاہور میں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر مَیں زیادہ شدت سے اپنے مستقبل کے متعلق سوچا کرتا تھا اور اسلامیہ کالج کے ماحول میں مَیں جو نئے افق دیکھا کرتا تھا وہاں مجھے منزلِ پاکستان آئے دن زیادہ حسین اور زیادہ قریب دکھائی دیتی تھی۔ میرا اُٹھنا بیٹھنا ان طلبا کے ساتھ تھا جو علامہ اقبال کا کلام پڑھا کرتے تھے اور قائدِ اعظم زندہ باد کے نعرے لگایا کرتے تھے۔

پہلے سال کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ میں نے کالج کے ہوسٹل میں اپنے لیے ایک ٹائم ٹیبل بنا لیا تھا اور اس پر بڑی سختی سے عمل کیا کرتا تھا۔ مَیں انگریزی اور اردو اخبار باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا۔ ہوسٹل میں تین لڑکے ایسے تھے جو میرے ساتھ علی الصباح سائیکلوں پر دریائے راوی تک جایا کرتے تھے اور وہاں ایک گھنٹہ کشتی رانی کیا کرتے تھے واپس آ کر ناشتہ کرتے اور کالج چلے جاتے تھے۔

جب ہمیں پی ٹی کے لیے اٹھنا پڑتا تھا اور ڈار صاحب لارنس گارڈن تک دوڑاتے تھے تو یہ سارے کام منسوخ ہو جاتے تھے۔ کالج میں جب کوئی گھنٹہ خالی ہوتا تھا تو میں سیدھا لائبریری پہنچتا تھا اور وہاں کوئی میگزین کتاب یا اخبار پڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ گروپ میٹنگ میں میری ملاقات فسٹ ایئر کے ایک طالبعلم منظور احمد سے ہوا کرتی تھی اور ہم بہت جلد بے تکلف دوست بن گئے تھے۔

کالج میں میرا دوسرا سال تھا۔ کرسمس کے دنوں میں گھر پہنچا تو اباجی جو چھٹی پر آئے ہوئے تھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا "تمھیں شکار کا بہت شوق ہے تو پرسوں صبح میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

جب ہم شکار پر روانہ ہوتے تو اباجان کے ایک نوکر کے علاوہ میرا ایک چچازاد بھائی اور گاؤں کا ایک اور آدمی ہمارے ساتھ چل پڑے۔ ہمارے گاؤں سے کوئی آٹھ میل دُور وہ وسیع چھمب تھا۔ جسے ضلع کی سب سے بڑی شکار گاہ سمجھا جاتا تھا...... ہمارا قیام علاقے کے ایک بہت بڑے زمیندار کے گھر پر تھا۔

اباجان جھیل کے کنارے کسی جگہ بیٹھ جاتے تھے اور وہاں مجھے شکار کھیلنے کی آزادی تھی۔

مَیں نے پہلے دن جو شکار مارا وہ بیشتر ہماری دعوتوں میں ختم ہو گیا۔

اگلے دن ہم علی الصباح شکار کے لیے گئے اور میں دو گھنٹے کے اندر اندر پچیس مرغابیاں شکار کر چکا تھا اور میں نے فوراً واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے دن کی بچی ہوئی مرغابیوں میں سے آٹھ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیں اور باقی انھیں فوراً ہمارے گھر پہنچانے کی تاکید کر کے روانہ کر دیا اور گھر پر سستانے کے بعد ہم مزید شکار کی امید پر دوسرے راستے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

دوپہر کے وقت راستے میں ابا جان نے ایک اور دوست کے ہاں کھانا کھایا اور وہاں سے چل پڑے۔ عصر کی نماز ہم نے ایک نہر کے کنارے ادا کی اور آگے چل پڑے۔ اچانک مجھے بڑی مُرغابیوں کی ایک قطار اُڑتی ہوئی نظر آئی جب میں بندوق سیدھی کرنے لگا تو ابا جان نے کہا "نہیں بیٹا، وہ بہت دُور ہیں"

میں نے کہا "ابا جان! جب وہ بہت قریب آجائیں گی تو میں فائر کروں گا۔ دیکھیے یہ نیچے آرہی ہیں۔ شاید راستے میں ہم نے جو چھوٹی سی جھیل دیکھی ہے یہ وہاں اتر جائیں۔"

"بیٹا یہ مگ ہیں اگر تم ان میں سے ایک دو شکار کر لو تو تمھیں انعام ملے گا۔"

"میں مرغابیوں کے رُخ پر تیزی سے بھاگنے لگا۔ مرغابیوں کی آوازیں بتدریج قریب آرہی تھیں۔ کماد کے کھیت کی اوٹ سے نکلنے کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دو مرغابیاں میرے سامنے گریں جنھیں میں نے ذبح کر لیا، لیکن تیسری مرغابی جو کچھ فاصلے پر کماد کے کھیت کے قریب گری تھی۔ ہم تلاش نہ کر سکے۔

ابا جان بہت خوش ہوئے۔ میں نے پوچھا۔

"جی! وُہ انعام کیا تھا، جو آپ مجھے دینا چاہتے تھے؟

نوٹ: مگ بہت بڑی مرغابی کی ایک قسم

ابا جان نے کہا: "تمھارا انعام تمھارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے سوچ کر یہ بتاؤ کہ تم یہ بندوق لینا پسند کرو گے یا تمھارے لیے نئی بندوق خرید لی جائے؟"

اُس وقت میرے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی، پھر کچھ دیر سوچ کر میں نے جواب دیا۔

"ابا جان! یہ بندوق بہت ہلکی ہے اور مجھے بہت بہت پسند ہے۔ آپ کوئی بڑھیا قسم کی نئی بندوق لے لیں"۔

"بہت اچھا بیٹا! میں واپس جانے سے پہلے یا جب دوبارہ آؤں گا تو یہ بندوق تمھارے نام کروا دوں گا" اور میں اتنا خوش تھا کہ مجھے باقی سفر محسوس تک نہ ہوا۔

شام کے قریب ہم عبدالکریم کی حویلی کے سامنے سے گزرے وہ پھاٹک کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ علیک سلیک کے بعد وہ اصرار کر کے چائے پلانے کے لیے اندر لے گیا۔ اُس کی حویلی میں بیٹھک کے علاوہ اُس کے رہائشی مکان کے چار نئے کمرے نیچے اور دو کمرے اُوپر تعمیر ہو چکے تھے۔ ابا جی نے مکان کو ایک نظر دیکھتے ہی کہا۔

"بھئی عبدالکریم یہ تو کمال کر دیا آپ نے! یہ گھر تو اچھی خاصی کوٹھی معلوم ہوتا ہے۔"

"جناب! ساری عمر یہی کام کرتا رہا ہوں۔ یہ علاقہ مجھے بہت پسند ہے پہلے تو میرا خیال یہی تھا کہ حویلی کے اندر دو تین کمرے کافی ہوں گے۔ اب میرے بال بچوں کو یہاں کی آب وہوا اس قدر پسند آئی ہے کہ وہ زیادہ وقت یہیں گزارنا چاہتے ہیں۔ امینہ پہلے ایسی اجاڑ جگہ میں قدم رکھنے سے بہت ڈرتی تھی۔ اب وہ کہتی ہے کہ میں گرمیوں کی چھٹیاں بھی یہیں گزارنا چاہتی ہوں۔ جب وُہ دو چار دن یہاں رہ کر جاتی ہے اُس کی صحت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔"

نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ ابا جان نے مغرب کی نماز کے لیے جائے نماز مانگی تو عبدالکریم پریشان سا ہو کر اندر چلا گیا۔ اُس کی بیوی ایک سفید چادر نکال لائی اور سلام کرنے کے بعد بولی۔

"بھائی جی! آپ اسی پر نماز پڑھ لیں۔ ابھی ہمارا سامان نہیں آیا۔"

میں نے چادر اُس کے ہاتھ سے لیکر بیٹھک کے ایک کونے میں بچھا دی۔

نماز سے فارغ ہو کر جب ہم دوسرے کمرے میں چائے کے لیے بیٹھے تو امینہ جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سلام کرنے کے بعد تذبذب کے عالم میں اپنے باپ اور امی کی طرف دیکھنے لگی۔ ابا جان نے پوچھا۔

"بیٹی آپ کون سی جماعت میں پڑھتی ہیں؟"

"اُس نے امی جان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ اگلے سال دسویں جماعت میں ہو جاؤں گی۔"

عبدالکریم بولا۔ میاں جی! میری بیٹی سات بیٹوں کے برابر ہے۔ اس کی اُستانیاں کہتی ہیں کہ میٹرک میں بہت اچھی پوزیشن لے گی۔"

رشیدہ نے کہا "میاں جی! اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ ماشاء اللہ! آپ کا یوسف بھی تو ہزاروں میں ایک ہے۔ اس علاقے کے کسان اور ان پڑھ لوگ بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کا نام روشن کرے گا۔"

"میں نے امینہ کی طرف پہلے کبھی توجہ نہ دی تھی۔ تاہم بہت دُبلی پتلی سی لڑکی اب کافی صحت مند اور پُرکشش بن چکی تھی۔ ابا جان نے چائے پینے کے بعد کہا۔

"یوسف! باہر سے نوکر کو بلاؤ اور جس تازہ شکار سے تم نے انعام حاصل کیا ہے۔ وہ ان کو پیش کر دو۔ جب بڑی مرغابیاں عبدالکریم کو پیش کی گئیں تو انہوں نے کہا۔

"میاں جی! یہ بہت بڑی ہیں۔ ہمارے لیے ایک ہی کافی ہے"۔ دوسری آپ اپنے پاس ہی رکھ لیں۔

ابا جان نے کہا۔ "میاں صاحب! ہمارے گھر میں کافی شکار پہنچ چکا ہے۔ آپ یہ مزے سے کھائیں!"

جب ہم رخصت ہو رہے تھے تو امینہ نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا اور وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی!

"بیٹا! یوسف! امینہ تمہاری امی، دادی اور تمہاری چچیوں اور بہنوں کو کسی دن آپ کے گھر جا کر دعوت دے گی"۔

ابا جان نے کہا "بیٹی! دعوت دینا ہمارا فرض ہے!

تمہارا جب جی چاہے ہمارے گھر آ جایا کرو۔ پھر کسی اچھے موقع پر انہیں تمہارے گھر آنے پہ کوئی اعتراض نہیں ہوگا"۔

راستے میں مجھے ابا جان کہہ رہے تھے۔

"بیٹا! عبدالکریم ایک اچھا آدمی ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی سی بے وقوفی کر لیتا ہے اور یہ بات ہر مالدار آدمی میں ہوتی ہے۔ وہ لڑکی بہت اچھی ہے لیکن اُس کی ماں ذرا چالاک ہے لیکن جب خاوند ذرا زیادہ سیدھا ہو تو عورتیں چالاک ہو ہی جایا کرتی ہیں"۔

اور میں ابا جان کی باتوں پر توجہ دینے کی بجائے بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ اگر امی جان وہ بڑی مرغابیاں دیکھتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔ جب وہ ایک اپنے لیے کافی سمجھتے تھے تو ابا جی نے دوسری دینے پر اصرار کیوں کیا تھا۔ مجھے جس قدر بندوق حاصل کرنے کی خوشی تھی اسی قدر عبدالکریم اور اس کی بیٹی پر غصہ آ رہا تھا۔"

منظور احمد کے چچا ڈلہوزی میں نائب تحصیلدار تھے میری طرح انہیں کانگڑہ جانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایف اے کے امتحان سے چند روز قبل منظور احمد کے چچا کا خط آیا کہ جب چھٹیاں ہوں تو تم چند دن کے لیے یہاں آجاؤ۔ اس نے جواب میں یہ لکھ دیا کہ میرا ایک دوست بھی کانگڑہ دیکھنا چاہتا ہے تو چچا نے لکھا بیٹا تمہارے جتنے دوست آئیں ان کے لیے جگہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ منظور احمد نے کالج کے ایک دوست محمود خان کو اپنی ٹیم میں بھرتی کر لیا۔ امتحان ختم ہوتے ہی ایک دن ہم بس پر سوار ہوتے اور ڈلہوزی جا پہنچے۔ دو دن ڈلہوزی گھوم کر ہم کانگڑہ کی طرف چل پڑے۔ منظور احمد کے چچا نے دھرم سالہ میں ہمارے قیام کے لیے ایک دوست کے ہاں انتظام کر دیا تھا اور ان کی ہدایت کے مطابق ہم نے اپنے کھانے اور چائے کا بندوبست ایک دکان نما ہوٹل میں کر لیا تھا۔ کانگڑہ کے پہاڑوں کی سیاحت میرے ان خوابوں کی تعبیر تھی جو میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ کئی کئی میل پیدل چلنے کے باوجود تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ جب میرے ساتھی نڈھال ہو کر سو جایا کرتے تھے تو میں تنہا کسی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ پانچویں دن وہاں سے واپس آتے ہوئے میں اپنے ساتھیوں کو اپنے گاؤں لے آیا وہاں وہ ایک رات ٹھہرے اور اگلے روز چلے گئے۔ گھر پہنچتے ہی چچا فتح محمد نے سخت شکایت کے لہجے میں کہا تھا "دیکھو یوسف! اگر تمہیں فرصت ملی تھی تو لاہور سے کانگڑہ جانے کی بجائے چند دن کے لیے سکھر سے ہو آتے۔ تم نے ان سے وعدہ بھی کیا تھا"

امی جان نے بھی ان کی تائید کی تو میں نے جواب دیا۔ "چچا جی میں کانگڑہ سے ایک لمبے سفر کی تیاری کر کے آیا ہوں۔ دیکھیے نا پچھلے دنوں میں زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے ناکارہ ہو گیا تھا۔ اب پہاڑوں میں ذرا سخت جان بن کر آیا ہوں۔ وہاں پہاڑ اتنے اُونچے تھے کہ مَیں بادلوں سے اونچا چلا جایا کرتا تھا۔ اب جس وقت امی جان اجازت

دیں گی میں سکھر چلا جاؤں گا۔ پھر یہ اتفاق تھا کہ جب میں سکھر پہنچا تو پتہ چلا کہ حسین احمد چھٹی لے چکے ہیں اور گھر آنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ احمد خان صاحب ان کے دوست تھے اور حسین احمد صاحب میری خاطر اپنی چھٹی منسوخ کروانا چاہتے تھے تو انہوں نے یہ کہا آپ یوسف صاحب کو سیر کروانے کے لیے اپنی چھٹی منسوخ نہ کروائیں۔ انھیں میں اپنے ساتھ کوئٹہ لے جاؤں گا۔ یہاں سے اتفاقات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مَیں ایک انتہائی معزز خاتون بیگم فریدہ احمد اور ایک بہت ہی پیاری بچی نسرین اور ان کے عزیزوں سے متعارف ہوا ہوں اور اس وقت میں ان لوگوں کا مہمان ہوں جو میرے لیے قطعاً اجنبی تھے۔ اور ان کے متعلق مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان اتفاقات کے باعث ایسے لوگوں سے بھی متعارف ہونے والا ہوں جو میری زندگی پر گہرا اثر ڈالیں گے۔

ننھی نسرین جس کے لیے میں نے دیکھتے ہی شہزادی نسرین کا نام پسند کیا تھا۔ جب گفتگو کرنے پر آتی ہے تو بہت کچھ بتا جاتی ہے۔ اُس نے جس معصومیت کے ساتھ اپنے والدین، اپنے بھائی، اپنی بڑی بہن کا ذکر کیا ہے اس کا اثر یہ تھا کہ ان کی تصویریں میرے دل پر نقش ہو گئی ہیں۔ مَیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ان مسکرانے، ہنسنے اور پیار کرنے والے لوگوں کو مدت سے جانتا ہوں۔ نانی اپنی نواسی یا کسی اور رشتہ دار سے جب نسرین کی بڑی بہن کے متعلق کوئی بات کرتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نسوانیت کی جن خوبیوں کا تصور کیا جاتا ہے وہ تمام فہمیدہ میں موجود ہوں گی۔ نسرین جیسی خوب صورت بچیاں خود پسند بھی ہو سکتی ہیں لیکن وہ فہمیدہ سے بے پناہ پیار کرتی ہے اور بات بات پر اس کا ذکر لے بیٹھتی ہے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ وہ واپسی کا سفر میرے ساتھ کر رہی ہیں۔ نسرین نے یہ فرض کر لیا ہے کہ میں گھر پہنچنے تک ان کے ساتھ رہوں گا۔ وہ بہت خوش ہے اور

کئی بار یہ کہہ چکی ہے۔

"بھائی جان میری آپا آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔" اور جب وہ سب
یہ کہیں گے کہ آپ چند دن کے لیے یہاں رُک جائیں تو آپ انکار نہیں کر سکیں گے
اگر آپا مغموم ہو کر رو پڑی تو پھر آپ کے لیے ہمارے گھر سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا
اور مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوگی۔

اس وقت مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ میں جس قدر زیادہ ایسے نیک اور پاکباز
لوگوں کے متعلق سوچتا ہوں اسی قدر حصولِ پاکستان کے لیے اپنی تڑپ میں اضافہ
محسوس کرتا ہوں۔ رات کے سناٹے میں میں ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی
لاکھوں بستیوں اور ہزاروں شہروں میں بسنے والے ان مسلمانوں کے متعلق سوچتا ہوں
جو اس وقت گہری نیند سو رہے ہوں گے اور میں برہمن استبداد کے اس عفریت
کو بھی کروٹیں لیتے دیکھ رہا ہوں جو برطانوی سامراج کا جانشین بننا چاہتا ہے اور میرے
دل سے درد بھری چیخوں کے ساتھ یہ دعا نکلتی ہے کہ میرے اللہ مجھے یہ ہمت دے
کہ میں اپنی قوم کو مستقبل کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے بیدار کر سکوں۔ میرے
قلم کو یہ طاقت دے کہ اس سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لوگوں کے دل میں اتر جائے
اور میں اپنی آنکھوں سے منتشر افراد کو قافلوں کی صورت اختیار کرتے دیکھوں اور یہ
قافلے ایک سیلِ ہمہ گیر کی طرح آگے بڑھیں اور برصغیر میں اپنے آخری دفاعی حصار
پر پاکستان کا پرچم نصب کر دیں۔ میرے اللہ مجھے وہ عزم و یقین عطا کر کہ میں بے دھڑک
ملت کی اجتماعی سلامتی کے راستے پر چلتا رہوں اور ہر قدم پر میرا یہ یقین پختہ ہوتا جائے
کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جو میں نے اختیار کیا ہے۔ میں تیری اعانت کے بھروسے پر
تنہا گھر سے نکلوں اور جب مڑ کر دیکھوں تو یہ نظر آئے کہ ان گنت راستوں اور پگڈنڈیوں
سے لوگ اسلام زندہ باد، پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے

نمودار ہو رہے ہیں۔"

آپ نے جس ملت کا پرچم اٹھایا ہے وہ احسان فراموش نہیں۔

آج مجھے بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا ہے کہ پاکستان کسی کی پسند یا ناپسند
کا مسئلہ نہیں بلکہ موت و حیات کا مسئلہ ہے اور جب قوموں کو موت و حیات کے مسائل
درپیش ہوں تو ایک فرد کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ یا اللہ مجھے ہمت دے کہ میں اپنی قوم
کی عظمتِ رفتہ کے گیت گاتا ہوا میدان میں آؤں۔ جوانانِ ملت کے دلوں میں
ناقابلِ شکست حوصلے بیدار کروں پھر اگر میں اس یقین کے ساتھ کہیں گر پڑوں کہ میں نے
اپنی ساری توانائی جس مقصد کے لیے صرف کی تھی وہ پورا ہو رہا ہے تو میں اس موت کو
بھی تیرا انعام سمجھوں گا۔ لیکن اس وقت میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں پاکستان کی جنگ
میں بھرپور حصہ لوں گا اور کسی دن ان بہت اچھے، بہت نیک اور بہت پیار کرنے
والے لوگوں کے پاس یہ پیغام لے کر آؤں گا کہ ہم نے وہ حصار بنا لیا ہے جس کے اندر
ہم اپنی شہزادیوں کے مستقبل کے متعلق اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔ میری ننھی بہن
نسرین اس وقت میں تمہارے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ آج سے کئی برس بعد بھی جب تم
بھائی جان یوسف کا ذکر کیا کرو تو تمہارا سر فخر سے اونچا ہو جایا کرے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں ایک ننھی بہن کے ساتھ سفر کر رہا ہوں اور ماں جی
سے راستے میں بہت سی باتیں ہوں گی لیکن مجھے اس بات کا ملال ہے کہ میں جالندھر تک
نہیں جا سکوں گا۔ کیوں کہ گھر میں میری امی بڑی شدت سے انتظار کر رہی ہوں گی لیکن یہ ممکن
ہے کہ ماں جی مجھے حکم دیں تو میں سرتابی نہیں کر سکوں گا۔

میں گھر پہنچ کر بڑی تفصیل سے بعض باتیں لکھوں گا۔ سرِدست صرف اس بات
کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ان بھیڑیوں کا بہت ممنون ہوں جن کی وجہ سے
میرا ان نیک لوگوں سے تعارف ہوا، اور جن کو دیکھ کر مجھے اس ملک میں نئی شدت

کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوا ہے "میرے اللہ میں اپنے لیے اپنی قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے اور ہر ایسے انسان کے لیے جو اس دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کا حق دار ہے۔ ہندو کی غلامی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

تیسرا حصّہ

راستے اور فاصلے

باب - ۲۱

۱۹۴۴ء یوسف کی زندگی کا مصروف ترین سال تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر کے باعث تحریکِ پاکستان کے ساتھ اس کی والہانہ شیفتگی قدرتی بات تھی جب وہ کالج میں داخل ہوا تھا تو اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث اسے یہ یقین تھا کہ وہ کسی دن دنیا کے کامیاب ناول نگاروں کی صف میں کھڑا ہوگا اور اب مستقبل کے متعلق اُس کی تمام خواہشات حصولِ پاکستان تک محدود ہو کر رہ گئیں تھیں اور جو مضامین اور افسانے وہ لکھا کرتا تھا اُن کا اولین مقصد تحریکِ پاکستان کو تقویت دینا تھا۔ اُس کے بعض ساتھی جو دو تین سال قبل دیہاتی زندگی کے متعلق اس کے دلچسپ مضامین اور افسانے پڑھا کرتے تھے اِس بات پر حیران تھے کہ اب مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے سوا اس کے ذہن میں کوئی چیز آتی ہی نہیں۔ ایک دن اُس کے ایک شفیق اُستاد نے کہا۔ "میاں یوسف! میں تمہاری ابتدائی تحریریں پڑھ کر ہی کہا کرتا تھا کہ تم ادب کی دنیا میں نام پیدا کرو گے۔ تم بڑی خوب صورتی سے دیہاتی زندگی کی عکاسی کیا کرتے تھے۔ تمہارے طنز و مزاح میں بڑی جان تھی۔ اب تم کس مخمصے میں پھنس گئے ہو؟ دیکھو بھائی سیاست کو سیاست دانوں کے لیے چھوڑ دو اور تم صرف اُس کام سے سروکار رکھو جس کے لیے تم پیدا ہوتے ہو۔"

یوسف نے جواب دیا۔

"جناب! اگر آپ کا یہ مطلب ہے کہ مجھے صرف ادیب بننے پر ہی اکتفا کرنا چاہیے تو آپ کو یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی ادیب اپنے آزاد وطن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور پاکستان کے سوا میں اپنے لیے اور کسی آزاد وطن کا تصور نہیں کر سکتا یہ کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ میری بقاء کا بھی اوّلین مسئلہ ہے"۔

پروفیسر صاحب نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میاں یوسف! شاید تم سچ کہتے ہو لیکن اس سال تمہیں بہت محنت کرنی چاہیے تاکہ فائنل میں بہت اچھے نمبر لے سکو"۔

اُس کے تاریخی افسانے اور سیاسی مضامین سب پاکستان کے لیے ہوتے تھے۔ وہ اپنے کالج اور کالج سے باہر مسلم لیگ کے اجتماعات میں پرجوش تقریریں کیا کرتا تھا۔ ماں نے کئی بار اس کے سامنے سنہری بالوں والی کمسن لڑکی کے خاندان کا پتہ کرنے کا مسئلہ چھیڑا تھا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا "کہ امی جان ابھی ان باتوں کا وقت نہیں، آپ مطمئن رہیں میں بی اے کرتے ہی انھیں تلاش کر لوں گا۔ آپ کو اس وقت تک ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے"۔

ایک دن یوسف منظور احمد اور کالج کے تین لڑکوں کے ساتھ، امرتسر، جالندھر لدھیانہ اور انبالہ کے شہروں کا دورہ کرنے کے بعد واپس آیا اور ماں جو اردو اخبار میں اُس کی تقریریں پڑھا کرتی تھی، بڑے اشتیاق سے اس کی کارگزاری سُن رہی تھی۔ جب یوسف نے جالندھر کا ذکر چھیڑا تو قدسیہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن یوسف نے جالندھر کے جلسوں کا حال سنانے کے بعد فوراً ہی لدھیانہ کا ذکر شروع کر دیا اور اس نے لدھیانے میں پروگرام کی تفصیلات سناتے ہوئے کہا۔ "امی جان ہمارا پروگرام یہ تھا کہ وہاں سے واپس آجائیں گے لیکن وہاں انبالہ کے چند معززین آئے ہوئے تھے اور وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اس لیے ہمیں چار کی بجائے چھ دن لگ گئے"۔

"بیٹا وہ لوگ تمہیں ملے تھے؟"

"وہ کون امی جان؟"

"سچ کہو تمہیں لدھیانہ جا کر بھی وہ خاتون یاد نہیں آئی جسے تم نے ماں جی کہا تھا اور تم اُس کمسن شہزادی کو بھی بھول گئے"۔

"امی جان میں انھیں بھولا نہیں ہوں"۔

"لیکن تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم اس کا انتظام کر لو گے۔ دو سال تو ہونے والے ہیں اس بات کو، تم جلسوں میں جا سکتے ہو لیکن ماں کی خوشی کے لیے تم نے بی اے پاس کرنے کی شرط رکھ دی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ خوشی میرے نصیب میں نہیں خیر تمہاری مرضی اب میں کچھ نہیں کہوں گی"۔

"امی جان مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اِس قدر بے چین ہیں"۔

"بیٹا یہ سب تمہارا قصور ہے۔ تم نے سنہری بالوں والی ایک کمسن شہزادی اور اس کی نانی کا ذکر ہی اس طرح کیا تھا کہ مجھے اسی دن سے ان کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا لدھیانے والی بیگم احمد صاحبہ نے عطر کی جو شیشی بھیجی تھی وہ میں نے ایک متبرک سی چیز سمجھ کر اُسی طرح رکھی ہوئی ہے۔ صرف ایک مرتبہ اور وہ بھی عید کے دن میں نے یہ شیشی کھولی تھی اور ایک قطرہ اپنے کُرتے پر مل لیا تھا پھر کئی دن مجھے اپنے کپڑوں سے بھینی بھینی خوشبو آتی رہی اور میں نے اسے ایک قیمتی تحفہ سمجھ کر اپنے بکس میں چھپا رکھا ہے اگر وہ بہن مجھے مل جاتی تو میں ہر عید کے موقع پر کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور بھیجا کرتی"۔

یوسف نے کہا "امی جان اگر آپ مجھے دو سال پہلے بتا دیتیں کہ آپ انھیں اتنا یاد کرتی ہیں تو میں کسی دقت کے بغیر یہاں بیٹھے ان کا پتہ معلوم کر لیتا"۔

"کیسے معلوم کر لیتے تم"؟

"امی جان وُہ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور میری تحریریں پڑھنے کے قابل سمجھی جاتی ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ جالندھر اور لدھیانہ میں میری کوئی تحریر پہنچ جائے۔ اُس کے لیے اخبارات و رسائل سے کام لیا جاسکتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات پہلے تمہارے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟"

"امی جان مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ضرورت ہوتی بھی تو میں یہ سوچتا کہ جتنی آسانی سے مَیں ان کا پتہ کرسکتا ہوں اُسی قدر آسانی سے وُہ میرا پتہ کرسکتے ہیں۔ مثلاً اگر مجھے یہ معلوم تھا کہ کوئٹہ میں اُن کے رشتہ داروں سے پتہ کیا جاسکتا ہے تو انھیں بھی یہ معلوم تھا کہ مَیں اسلامیہ کالج میں پڑھتا ہوں اور وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل یا عملہ کے اور کسی آدمی سے میرا پتہ پوچھ سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسی ہچکچاہٹ حائل ہوگئی تھی جس میں وقت کے ساتھ بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔"

"اب تمہیں یہ امید ہے کہ اگر انھیں تمہارے کسی مضمون سے تمہارا پتہ مل گیا تو وُہ فوراً تمہیں خط لکھیں گی؟"

"مجھے یقین ہے امی جان!"

ایک ہفتہ بعد لاہور کے ایک بااثر روزنامہ اخبار میں ملک کی سیاست پر یوسف کا ایک زوردار مضمون شائع ہوا۔ ایڈیٹر نے مضمون نگار کے تعارف کے لیے اُس کی تصویر کے ساتھ اپنے نام سے ایک مختصر تعریفی نوٹ بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ مضمون اگلے روز دوسرے شہروں کے اخبارات میں بھی چھپ گیا اور چند دن اس کے خلاف کانگریسی اخبارات میں لے دے ہوتی رہی۔

گیارہ دن بعد ایک روز یوسف لائبریری میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ایک چپڑاسی نے آکر پیغام دیا۔

"جناب پرنسپل صاحب اپنے کمرے میں بلاتے ہیں۔"

یوسف تھوڑی دیر بعد پرنسپل کے آفس میں داخل ہوا تو اُس نے اپنے قریب ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آئیے تشریف رکھیے۔"

یوسف بیٹھ گیا۔

پرنسپل چند ثانیے اُس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اُس نے سوال کیا۔

"یوسف صاحب آپ ۱۹۴۲ء میں کوئٹہ گئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"وہاں آپ نے بھیڑیوں سے کسی کی جان بچائی تھی؟"

"جناب میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مَیں نے کسی کی جان بچائی تھی۔ بات یہ ہوئی تھی کہ میں ایک کھڈ کے کنارے کنارے ایک ویران پہاڑ کی چوٹی کی طرف جارہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ دو بھیڑیے کھڈ کے دوسرے کنارے میرے ساتھ ساتھ جارہے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ کھڈ اتنی گہری تھی کہ وہ میری طرف آ نہیں سکتے تھے اور میں نے مڑ کر نیچے اترنا شروع کردیا۔ پھر کچھ دُور جاکر مَیں نے یہ دیکھا کہ ایک آدمی کھڈ کے اُس کنارے جہاں میں نے بھیڑیے دیکھے تھے۔ تیزی سے اُوپر چڑھ رہا ہے۔ مَیں نے اُسے خبردار کرنے کے لیے پوری قوت سے آوازیں دیں۔ میرے ساتھیوں نے جو پیچھے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ شور مچایا مگر اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب اس کو خبردار کرنے کی یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ میں پہاڑ کی بلندی کی طرف بھاگتا ہوا بالآخر اس جگہ پہنچ جاؤں جہاں چوٹی کے قریب کھڈ کے کنارے ملتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سخت جدوجہد کے بعد میں اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اسے اپنے ساتھ اُس جگہ لے آیا جہاں میرے ساتھی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے ورنہ اُس نے بھیڑیا نہیں دیکھا تھا اور نہ مجھے دوبارہ وہ بھیڑیے نظر آئے تھے۔"

پرنسپل نے کہا "اور تم نے اس شخص کے خاندان کی ایک معزز خاتون اور اُس کی کمسن نواسی کے ساتھ کوئٹہ سے امرتسر تک کا سفر بھی کیا تھا"

"جی ہاں"۔

"اور تمہاری کوئی چیز بھی گاڑی میں رہ گئی تھی"۔

"جی ہاں"۔

پرنسپل نے اپنے میز کی دراز کھول کر ایک بڑے سائز کا لفافہ نکالا اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لے جاؤ اور اسے اطمینان سے پڑھو۔ باہر کے لفافے پر میرا نام ہے اور دو صفحات اور اندر جو دوسرا خط ہے وہ تمہیں پہنچانے کی درخواست کی گئی ہے۔

بیٹا! یہ دونوں خط تمہاری خاطر لکھے گئے ہیں اور اس بڑے لفافے کے اندر موجود ہیں۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ جن لوگوں نے اتنی مدت کے بعد تمہیں خط پہنچانے کا نیا طریقہ نکالا ہے انھیں فوراً جواب لکھو کہ تم وہی یوسف ہو جن کی انہیں تلاش ہے اور تمہارے کالج کے پرنسپل نے کسی تاخیر کے بغیر اُن کا خط تمہارے پاس پہنچا دیا ہے"۔

یوسف کے چہرے پر مسکراہٹیں اور دل میں دھڑکنیں تھیں۔

وہ پرنسپل کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

یوسف تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس لائبریری میں پہنچا اور وہاں ایک کونے میں بیٹھ کر خطوط پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ پرنسپل کے نام جو خط تھا وہ نسرین کی طرف سے تھا اُس نے کسی حد تک تفصیل کے ساتھ کوئٹہ سے سفر کے دوران اور اُس سے قبل یوسف کے بہادرانہ کارناموں کا ذکر کیا تھا اور آخر میں یہ لکھا تھا کہ آپ کے کالج کے یہ طالب علم جنہوں نے سفر کے دوران کئی نازک مرحلوں پر ہماری مدد کی تھی۔ امرتسر گاڑی سے اُترتے ہوئے اپنا کچھ نہایت قیمتی سامان ہمارے سامان کے ساتھ چھوڑ گئے

تھے۔ بدقسمتی سے اُن کا ایڈریس ہمارے پاس نہیں تھا اور ہمارے گھر کا ایڈریس جو انہیں لکھ کر دیا گیا وہ بھی سامان کے ساتھ ہی بھول گئے تھے۔ اب پچھلے دنوں پاکستان کے متعلق ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس سے مَیں یہ اندازہ لگا سکتی ہوں کہ اسلامیہ کالج میں وُہ کافی مشہور ہوں گے اور آپ بھی انہیں جانتے ہوں گے۔ اِس لیے مَیں آپ سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ دوسرا لفافہ جو اُن کے لیے بھیجا جا رہا ہے وُہ انہیں پہنچا دیجئے ورنہ مندرجہ ذیل ایڈریس پر واپس کر دیجئے۔

یوسف نے دوسرا لفافہ نکال کر کھولا اور پڑھنے میں منہمک ہوگیا۔ اُسے سیدھے سادھے الفاظ کے ساتھ ایک کمسن بچی کی دل کش آواز سنائی دے رہی تھی۔

نسرین نے لکھا تھا بھائی جان! السلام علیکم!

ہمارے گھر میں آپا فہمیدہ کے سوا سب ہی کہتے ہیں کہ آپ مجھے بھول چکے ہوں گے لیکن مجھے کبھی یقین نہیں آتا۔ مَیں ہر روز یہ دعا مانگ کرتی ہوں کہ آپ کسی دن اچانک آجائیں اور مجھے اس بات کی شکایت نہیں کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ یہ خط میں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپا فہمیدہ نے اخبار میں آپ کا مضمون پڑھا اور پھر مجھے یہ حکم دیا کہ مَیں آپ کو فوراً خط لکھوں۔ انگریزی میں پرنسپل کا نام اور ایڈریس انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ بھائی جان یہ بھی تو غضب کیا نا آپ نے کہ اُترتے وقت وہ تھیلا وہیں چھوڑ گئے جس میں آپ نے اپنی کتابیں اور قیمتی مسودہ رکھا ہُوا تھا۔ مَیں اُس وقت بہت سٹپٹائی تھی جب مجھے یہ یاد آیا کہ اپنا ایڈریس بھی میں نے آپ کی مسودے والی نوٹ بک پر لکھ دیا تھا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی تھی کہ نانی جان نے آپ کا ایڈریس اس لیے نہیں لکھوایا تھا کہ خط و کتابت کی ابتداء آپ کریں گے۔ بھائی جان مَیں نے آپ کا تھیلا سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ گھر میں آپا فہمیدہ کے سوا کافی عرصہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ اس میں کیا ہے۔ پھر جب میں نے بار بار آپا فہمیدہ

کو سفر کے واقعات سنائیے تو نانی جان کی طرح انھیں بھی آپ کی ہر بات پسند آنے لگی۔ بھائی جان اب آپ اس بات پر خفا نہ ہوں کہ ایک دن میں نے اور آپا جان نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آپ کی غیر حاضری میں آپ کا سامان دیکھ لیں یا آپ کی کوئی کتاب پڑھ لیں تو یہ کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ آپا فہمیدہ تو یہاں تک کہتی تھیں کہ تمہارے بھائی جان نے اگر کوئی اچھی چیز لکھی ہے تو انھیں پڑھنے والوں پر خوش ہونا چاہیے۔ بھائی جان اگر آپا کی یہ بات درست ہے تو آپ کو اس بات پر بہت ہی خوش ہونا چاہیے کہ انہوں نے پہلے سال ہی آپ کی لکھی ہوئی کتاب کو تین بار پڑھا تھا اور اب بھی کبھی کبھی مجھے بلا کر یہ حکم دیا کرتی ہیں کہ مجھے فلاں واقعہ یا فلاں صفحہ سے آگے پڑھ کر سناؤ اور میرا خیال ہے کہ آپ کی کتاب کے ساتھ میری دلچسپی بھی بڑھتی ہی جاتی ہے گی۔ آپ یہ سن کر بھی خوش ہوں گے کہ امی جان بھی آپ کی کتاب پڑھ چکی ہیں۔ وہ آپ کی امی جان کو سلام کہتی ہیں اور آپ کے لیے بہت دعائیں کرتی ہیں۔ آپا فہمیدہ نے انہیں بھی یقین دلا دیا ہے کہ آپ کسی دن بہت بڑے ناول نگار بنیں گے۔

بھائی جان! آپ جواب ضرور لکھیں ورنہ آپ کی ننھی شہزادی آپ سے روٹھ جاتے گی۔ ایک دن، ایک مہینہ یا ایک برس کے لیے نہیں، ہمیشہ کے لیے رُوٹھ جاتے گی۔ مَیں نے جالندھر میں اپنے گھر کا اور لدھیانے میں نانی جان کے گھر کا ایڈریس لکھ دیا ہے، یہ دونوں پتے کسی ایسی نوٹ بک پر لکھ لیں جس کے گم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو، بلکہ میں تو یوں کہوں گی کہ جب آپ کے گھر کا ایڈریس ملے گا تو اُسے کئی دیواروں اور کئی کاپیوں پر نقل کر لوں گی۔ بھائی جان امّی کہتی ہیں کہ اگر آپ کسی دن اچانک اپنی امی جان کے ساتھ جالندھر آ جائیں تو ہماری عید ہو جاتے گی۔

چچا عبدالعزیز کا خط آیا ہے کہ شاید وہ عنقریب تبدیل ہو کر لاہور پہنچ جائیں گے اور ہم سب کو یہ خوشی ہے کہ ہمیں ان کی وجہ سے لاہور کی سیر کا موقع مل جایا کرے گا۔

ایک ضروری بات کرنا بھول گئی تھی:

آپا فہمیدہ نے آپ کی لکھی ہوئی کتاب اور تھیلے میں باقی سامان سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ پچھلی عید پر انہوں نے مجھے اور اپنی سہیلیوں کو کچھ تحفے دیے تھے اور بازار سے آپ کے سامان رکھنے کے لیے ایک نیا بکس بھی خرید لائی تھیں۔ یہ بکس انھوں نے اپنے جیب خرچ سے خریدا تھا۔ کیونکہ وہ کہتی تھیں کہ اچھی چیزیں اچھے بکس میں بند ہونی چاہئیں۔ انہیں یہ ڈر بھی تھا بھائی جان کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں لیکن مَیں نے انھیں مطمئن کر دیا تھا کہ میرے بھائی جان کسی اچھی بات پر ناراض نہیں ہوا کرتے اب میں یہ پوچھتی ہوں کہ آپ کا سامان آپا فہمیدہ کی حفاظت میں رہے یا کسی نوکر کے ہاتھ آپ کے گھر بھیج دیا جائے۔ جی تو چاہتا ہے کہ آپ کو اتنا لمبا خط لکھوں کہ آپ پڑھتے پڑھتے تھک جائیں لیکن صبح سکول بھی تو جانا ہے نا اور آپا جان کا حکم ہے کہ مجھے سیکنڈ نہیں ان کی طرح ہر کلاس میں فسٹ آنا چاہیے۔ اس لیے باقی باتیں دوسرے خط میں ہوں گی۔

زیادہ آداب

آپ کی نسرین

اِس سے آگے خالی صفحہ کا کچھ حصّہ چھوڑ کر یہ لکھا ہوا تھا۔

"بھائی جان! عجیب بے وقوف ہوں میں بھی، جب وقت آتا ہے تو ضروری باتیں بھول جاتی ہوں۔ مثلاً میں کئی دن سے یہ سوچ رہی تھی کہ جب مَیں آپ کو خط لکھوں گی تو میری پہلی درخواست یہ ہوگی کہ آپ اپنی ایک چھوٹی سی تصویر ضرور بھیج دیں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے آپ کی شکل یاد نہیں رہی بلکہ اِس لیے کہ گھر میں بہت سے لوگوں نے آپ کو نہیں دیکھا اور آپا

فہیدہ تو آپ کی تصویر دیکھ کر بہت ہی خوش ہوں گی۔ ویسے انھیں جب یہ پتہ لگے گا کہ میں نے اپنے خط میں ان کا ذکر کیا تھا میری پٹائی ضرور ہو گی۔ آپ کی امی ابّو اور گھر کے سب بزرگوں کو ہم سب کی طرف سے سلام۔ آپا کہتی تھیں کہ آپ جیسے مصروف لوگوں کے پاس خط لکھنے کا وقت نہیں لیکن آپ کے متعلق میرا خیال ہے کہ جس قدر میں نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر لکھا ہے اُس سے زیادہ آپ چند منٹ میں لکھ سکتے ہیں۔

اُسی روز دوپہر کے وقت یوسف علیحدہ کمرے میں ماں کے ساتھ بیٹھا نسرین کا خط پڑھ کر سُنا رہا تھا اور عصر کی نماز کے بعد وُہ جواب لکھ رہا تھا۔ اُس نے پہلے نسرین کی نانی کو لکھتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا تھا کہ جب میں نے اپنے گھر پہنچ کر امی جان کو نسرین اور آپ کے ساتھ سفر کے حالات بتائے تو وُہ بھی اس بات پر بڑی پریشان ہوئیں تھیں کہ میں اپنا تھیلا جس کے اندر ایک نوٹ بک میں آپ کے ایڈریس لکھے ہوئے تھے گاڑی میں ہی بھول آیا تھا۔ وہ اکثر یہ دعا کیا کرتی تھیں کہ اگر کبھی جالندھر جانے کا موقع ملا تو میں نسرین کی والدہ کو تلاش کروں گی۔ ماں جی میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے آپ کو تلاش نہ کر سکا۔ ورنہ یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ نسرین کے نام طویل خط میں اُس نے لکھا تھا۔ ننھی شہزادی تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں تمھیں ایک دن کے لیے بھی نہیں بھولا۔ تم ہمارے گھر میں کافی مشہور ہو چکی ہو اور سب مجھے اس بات پر کوستے ہیں کہ تم نے شہزادی کا ایڈریس گنوا کیوں دیا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میرا سامان گم نہیں ہونے دیا۔ ورنہ اگر وہ مسودہ گُم ہو جاتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔ تمہاری آپا فہمیدہ کا بھی میں ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کی حفاظت اپنے ذمّے لے لی ہے اور میری پہلی تحریر کو اس قدر دل چسپی کے ساتھ تین بار پڑھنے کے لیے بھی میں ان کا شکر گزار ہوں۔ میں یہ

دیکھتا رہا ہوں کہ ہمیں پاکستان کی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا اور مجھے اس کتاب کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں ملے گا۔ آپ کی فہمیدہ آپا سے یہ درخواست ہے کہ وہ اس وقت تک یہ مسودہ اپنے پاس رکھیں جب تک کہ میں حصولِ پاکستان کے لیے اپنی ذمہ داریوں سے فارغ نہیں ہو جاتا۔ اپنا آزاد وطن یہ انسان کی پہلی ضرورت ہے اور ایک ناول نگار عام انسانوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ تصویر بھیج دی جائے گی اور اگر امی جان رضامند ہو گئیں تو ان کی تصویر بھی میرے ساتھ ہو گی۔

تمہارے والدین، فہمیدہ صاحبہ اور دوسرے بہن بھائیوں کو سلام۔ انشاءاللہ میں آپ کو اپنے حالات سے باخبر رکھوں گا لیکن اگر کبھی مجھ سے لکھنے میں کوتاہی ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ شہزادی نسرین مجھ سے روٹھ جائے۔ امی جان آپ سب کے لیے دعائیں کرتی ہیں اور آپ کی والدہ کو سلام کہتی ہیں۔ میں گاؤں میں اپنا مستقل پتہ اور لاہور کا موجودہ ایڈریس لکھ رہا ہوں، لیکن خطوط فی الحال آپ کو لاہور کے ایڈریس پر لکھنے چاہئیں۔ امی جان کے حکم پر تعارف کے لیے ان کا نام لکھ رہا ہوں۔ ان کا نام قدسیہ بیگم ہے اور وہ آپ کی امی اور نانی جان کا نام پوچھتی ہیں۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ آپ کا بھائی

یوسف

یوسف نے خط ختم کرنے کے بعد پوچھا۔ "امی جان آپ کچھ اور لکھوانا چاہتی ہیں"۔

"بیٹا! میں بہت کچھ لکھوانا چاہتی ہوں لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ خط کسی تاخیر کے بغیر اُن کے پاس پہنچ جائے۔ تصویر بعد میں چلی جائے گی۔"

"امی جان میں ابھی جی پی او جاتا ہوں۔ انشاء اللہ یہ خط شام کی ڈاک میں نکل جائیں گے۔"

"اچھا بیٹا جاؤ۔ لیکن سائیکل ذرا احتیاط سے چلانا۔ خط اگر ایک دن بعد بھی پہنچ جائے تو کوئی حرج نہیں۔"

"امی جان میں اطمینان سے جاؤں گا۔ ڈاک میں کافی وقت ہے۔"

یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا۔

○

دو ہفتے بعد یوسف کالج سے گھر آیا تو ماں نے کہا۔

"بیٹا! اُن کا خط آیا ہے۔ میں نے تمہاری الماری کے نچلے خانے میں رکھ دیا ہے۔"

"کس کا خط امی جان؟"

"بھئی جالندھر والوں کا۔ تم پڑھ سکتے ہو لیکن کہیں گم نہ کر دینا۔ اُن لڑکیوں کی امی نے براہ راست مجھے لکھا ہے۔ کوئی پڑھی لکھی خاتون معلوم ہوتی ہیں۔ یوسف! جواب لکھتے ہوئے مجھے یہ الجھن ہو گی کہ میرا خط بہت خراب ہے۔"

"امی جان! یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ ہیڈ رائیٹنگ تو بعض بڑے بڑے مصنفوں کی بھی خراب ہوتی ہے اور آپ کا خط اتنا بُرا بھی نہیں کہ پڑھا نہ جا سکے۔"

ماں کے خط کے ساتھ نسرین اور فہمیدہ نے تمہیں چند سطریں لکھی ہیں۔ خط پڑھ کر انہیں جواب لکھ دو تاکہ میں ان کی والدہ کی معرفت بھیج دوں۔ صفیہ یعنی لڑکیوں کی والدہ نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ لدھیانے میں ان کی امی بھی ہمارے متعلق سُن کر بڑی خوش ہوں گی اور اُن کی طرف سے فوراً جواب آئے گا۔ بیٹا! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یکایک ہم سے قریب آ گئے ہیں اور میں اُن لڑکیوں کو

لاہور میں اگر کسی جگہ دیکھوں تو فوراً پہچان لوں۔ بیٹا میں تصویر کھنچوانے سے ہچکچاتی تھی لیکن اب میں کل ہی تمہارے ساتھ فوٹو گرافر کے پاس جاؤں گی اور اس خط کے جواب کے ساتھ ہی انہیں تصویر بھیج دی جائے گی۔ میں جب ان کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فہمیدہ کو میں نے بارہا دیکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اپنے کمرے میں خط پڑھ رہا تھا۔ ایک علیحدہ صفحے پر نسرین کے خط کے ساتھ ایک صاف ستھری ہینڈ رائیٹنگ کی چند سطور پر نظر پڑتے ہی اُسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ فہمیدہ کی تحریر ہے۔ اُس نے لکھا تھا محترم یوسف صاحب! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

میں نسرین کے خط کے فوری جواب کے لیے آپ کی بے حد شکر گزار ہوں اور نانی جان کو آپ کا خط ملنے پر جو خوشی ہو گی وہ تو میں بیان ہی نہیں کر سکتی۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو اس دنیا میں آ کر دوسروں کو خوشیاں تقسیم کرتے ہیں۔ میں اپنی بہن کی شکر گزار ہوں کہ وہ آپ کا مسودہ جو آپ گاڑی میں بھول آئے تھے سنبھال کر گھر لے آئی۔ اُس شریر لڑکی نے یقیناً آپ کو یہ لکھا ہو گا کہ میں ہر وقت آپ کا مسودہ پڑھتی رہتی ہوں لیکن میں یقیناً اسے تین بار پڑھ چکی ہوں اور ہر بار مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ایک نیک اور بہادر آدمی اس دنیا میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے مسکراہٹیں اور قہقہے تقسیم کر رہا ہے۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد اس کتاب کو مکمل کریں۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد ایک ناول نگار کی حیثیت سے مستقبل کے متعلق بلند ترین توقعات پوری ہوں گی۔ اور دیکھئے آپ کا مسودہ جو نامکمل حالت میں میرے پاس پڑا ہوا ہے اُسے بہر حال آپ نے مکمل کرنا ہے۔ میں اس کی بہت حفاظت کیا کرتی ہوں۔ ویسے بھی اُس کے گم ہو جانے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ ایک دو بار اور پڑھنے کے بعد وہ مجھے پوری طرح زبانی یاد ہو جائے گا۔

تیسرے دن یوسف اور اس کی امی کی طرف سے اِس خط کے جواب کے ساتھ ایک گروپ فوٹو جس میں اُس کی ماں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یوسف اُس کے پیچھے اور چھوٹے بہن بھائی دائیں بائیں چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیجی جا چکی تھی۔ قدسیہ بیگم نے نسرین کی امی صفیہ کو اپنے ہاتھ سے ایک طویل خط لکھا تھا جس میں اُس نے اُسے اور اُس کے بچوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری بہن آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت آپ کی شکلیں گھومتی رہتی ہیں۔ میں اللہ سے دُعا کرتی رہتی ہوں کہ مجھے گھر سے نکلنے کا موقع ملے اور میں سیدھی آپ کے پاس اور پھر آپ کی امّی کے پاس جاؤں۔ یوسف نے اپنی تحریر سے فہمیدہ کی دل چسپی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا۔ آپ کے خط سے یقیناً میری حوصلہ افزائی ہوئی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ جیسی ذہین طالبات کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اگر اُس مسودے کی وجہ سے آپ نے کسی مضمون میں اپنی توقعات سے کم نمبر لیے تو میں اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دوں گا اور دیکھیے وہ لوگ کم خوش نصیب نہیں ہوتے جو دوسروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی کامیابیوں پر خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ بات، ہمیشہ میرے ذہن میں رہے گی۔ آپ نے اس وقت میری حوصلہ افزائی کی ہے جب مجھے کوئی نہیں جانتا۔

دوسرا خط جالندھر بھیجنے کے پانچ دن بعد لدھیانہ سے نسرین کی نانی کا خط آیا اُس نے یوسف اُس کے والدین اور اُس کے بہن بھائیوں کو بہت دعائیں دی تھیں اور اس بات پر معذرت کی تھی کہ علالت کے باعث میں فوراً خط نہ لکھ سکی۔ بخار تو میرا اُسی دن ٹوٹ گیا تھا جس دن مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ یوسف بیٹا

اور اُس کے گھر کے تمام لوگ بخیریت ہیں لیکن میں یہ پروگرام بناتی رہی کہ ذرا کمزوری دور ہو جائے تو جالندھر جاؤں اور وہاں سے صفیہ بیٹی کو لے کر تمہاری امّی سے ملاقات کے لیے لاہور جاؤں۔ بیٹا تم کچھ اس طرح اپنی ماں کا ذکر کیا کرتے تھے کہ ہم سب کے دل میں انہیں دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ پھر پندرہ دن اور گذر گئے اور جالندھر سے کوئی خط نہ آیا۔ یوسف کے نزدیک یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن اُس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی۔

"بیٹا ان کا خط آج بھی نہیں آیا۔"

اور ایک دن وہ یہ کہہ رہی تھی۔

"بیٹے! کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم ایک اور خط لکھ کر اُن کی خیریت پوچھ لو۔"

"امی جان خط لوگ روز روز تو نہیں لکھا کرتے۔ اُن کا خط نہ آنے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہاں سب بخیریت ہیں۔"

"بیٹے یہ بھی ٹھیک ہے لیکن کبھی کبھی مجھے یہ خوف محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاید میں انہیں نہ دیکھ سکوں۔"

"امی جان ایسی باتیں نہ کریں۔ ذرا بارشیں شروع ہو جائیں تو میں خود آپ کو اُن کے پاس لے جاؤں گا۔"

ایک دن میاں عبدالرحیم نے دفتر سے گھر واپس آتے ہی کہا۔ "قدسیہ آج عبدالکریم مجھے دفتر آکر ملا تھا کہتا تھا لاہور میں جو کوٹھی اُس نے بنانی شروع کی تھی وہ مکمل ہو گئی ہے۔ اب عنقریب اُس کی بیوی اور بچے یہاں آئیں گے اور نئی کوٹھی میں ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا جائے گا۔ اُس نے مجھ سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم سب اس دعوت میں شریک ہوں گے۔ ویسے وہ اپنی کوٹھی دکھانے کے لیے اتنا بے تاب

تھاکہ مجھے دفتر سے اُٹھاکر سیدھا وہاں لے گیا۔ کوٹھی واقعی بہت اچھی ہے لیکن اُس کا مقصد اپنی نئی کار دکھانا بھی تھا۔ بار بار یہ کہتا تھا کہ امینہ اور اس کی امّی خُود آکر آپ کو کار پر لے جائیں گی اور دعوت کے بعد آپ کو گھر پہنچا دیا جائے گا۔ مجھے یہاں پہنچانے اور ہمارے گھر کا راستہ دکھانے کے لیے اُس نے ڈرائیور کو بھیج دیا تھا اور دیکھو یوسف تمہارے متعلق اس نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ تمہیں اپنے سب دوستوں کے ساتھ دعوت میں شریک ہونا چاہیے۔ مَیں اس موسم کی دعوتیں پسند تو نہیں کرتا لیکن اگر میں دَورے پر چلا گیا تو تم اپنی ماں کے ساتھ چلے جانا۔ باقی بچوں کو لے جانے کی ضرورت نہیں"۔

قدسیہ نے کہا۔ "اگر امینہ آئی تو وُہ ہم سب کو لے جانے پر ضد کرے گی۔ نمائشی دعوتوں کا اُس کی ماں کو بھی بڑا شوق ہے"۔

"قدسیہ اصل میں بات یہ ہے کہ بچّے اپنے والدین سے بُری عادتیں سیکھتے ہیں۔ عبدالکریم اتنا مالدار ہے کہ اُسے ہر قسم کی نمائش سے بالاتر ہونا چاہیے لیکن دولت اُس کا اوچھاپن دُور نہیں کر سکی"۔

قدسیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا "آپ ہاتھ دھو لیں میں کھانا لگاتی ہوں"۔

کھانا کھانے کے بعد بچّے اپنے کمروں میں چلے گئے تو عبدالرحیم نے قدسیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم یہ سُن کر خوشی سے اچھل پڑو گی کہ امینہ خود تمہیں لینے کے لیے آئے گی لیکن تم کچھ پریشان سی نظر آتی ہو"۔

قدسیہ نے جواب دیا۔ "میری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی جب آپ اپنے دوستوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو آپ کو یہ خیال نہیں رہتا کہ بچے آپ کی باتیں سُن رہے ہیں اور ان پر ان باتوں کا اثر پڑے گا"۔

"دیکھو قدسیہ میں مانتا ہوں کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے لیکن یہاں یوسف

ہی تو ہے جسے ان لوگوں کے ذکر سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن اللہ کے فضل سے وہ اتنا سمجھدار ہے کہ غلط باتوں میں کسی کی پیروی نہیں کر سکتا۔ نہ معلوم میرے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا تھا کہ امینہ کا ذکر سن کر تمہارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہوشیار لڑکی ہے۔ اس کی شکل و صورت بھی اچھی ہے اور اس کا باپ کہتا تھا کہ وہ کار چلانا بھی جانتی ہے اور وہ نئی کار جو مجھے یہاں چھوڑ کر گئی ہے اس کے لیے خریدی گئی ہے"۔

ایوب جو دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا آگے بڑھ کر بولا "اباجی! وہ بس بھی چلا لیتی ہے نا"۔

میاں صاحب اور قدسیہ ہنس پڑے۔

تین دن بعد دورے پر روانہ ہوتے ہوتے عبدالرحیم نے قدسیہ بیگم سے کہا۔ "آپ کو یاد رہے گا کہ عبدالکریم نے آئندہ جمعہ کے روز دعوت کی ہے"۔

"جی ہاں مجھے یاد ہے"۔

"انشاء اللہ میں دعوت پر پہنچ جاؤں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ایک دن پہلے آجاؤں لیکن آپ میرا انتظار نہ کریں۔ کیونکہ دورے کا پروگرام طویل بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی یہ خواہش ہو گی کہ میری طرح آپ بھی دعوت کھانے سے قبل ان کی کوٹھی دیکھ آئیں اس لیے وہ کسی وقت بھی آپ کو آکر لے جائیں گے۔ اگر امینہ اور اس کی ماں اچانک آپ کو بلانے آجائیں تو ان کی دل شکنی نہیں ہونی چاہیے"۔

"جی آپ فکر نہ کریں"۔ قدسیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

جمعرات کے دن یوسف صبح کی نماز سے فارغ ہو کر کچھ دیر سیر کرنے کے بعد ناشتے پر بیٹھا تھا کہ کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نوکر نے بھاگ کر اطلاع دی "جناب عبدالعزیز صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہیں تو سادہ سے آدمی لیکن کہتے ہیں کہ میں

پولیس انسپکٹر ہوں اور یوسف صاحب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔" یوسف نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا "تم ناشتہ بیٹھک میں لے آؤ۔"

"امی جان! اُن کے لیے کوئی اچھی چیز بھجوا دیں۔"

یوسف باہر نکلا تو عبدالعزیز اُس سے بغلگیر ہو کر ملا اور اُس کے ساتھ بیٹھک میں آگیا۔

"چچا جان! تشریف رکھیے اور مجھے پہلے بتائیے کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور آپ کا سامان کہاں ہے"؟

عبدالعزیز مسکرایا "بھائی میرا سامان میرے گھر میں ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ وہ گھر کہاں ہے تو مختصر جواب یہ ہے کہ گھر بھی لاہور میں ہے۔ میری یہاں بدلی ہو گئی ہے اور بدلی اس لیے ہو گئی ہے کہ ہمارے ایس پی صاحب جس جگہ تبدیل ہوتے ہیں مجھے اُس جگہ تبدیل کروا لیتے ہیں۔ اب وہ ریلوے پولیس کے ڈی آئی جی بن گئے ہیں اور میرے حال پر اب بھی مہربان ہیں۔ خیال ہے کہ میری بھی ترقی ہو جائے گی۔ لاہور میں میرے خسر کی جائیداد سے ایک مکان میری بیوی کے حصے میں آیا تھا اس کا کچھ حصہ بن چکا تھا اور کچھ بننے والا ہے۔ دو سال سے وہ خالی پڑا تھا اب ہم اُس کو آباد کر رہے ہیں۔"

"چچا جان آپ کو یہ گھر تلاش کرنے میں دقت تو پیش نہیں آئی"؟

"بالکل نہیں، اور اس کی وجہ تمہیں تھوڑی دیر بعد معلوم ہو جائے گی۔ اب تم فوراً تیاری کرو۔ ہمارے گھر میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے اور آپ سے زیادہ آپ کی امی کا اور انھیں یہ کہہ دیجیے کہ تانگہ باہر کھڑا ہے۔"

نوکر نے ناشتہ لا کر تپائی پر رکھ دیا اور یوسف نے کہا۔

"جناب پہلے ناشتہ کر لیجیے میں امی جان سے کہہ آتا ہوں کہ وہ تیار ہو جائیں۔"

یوسف تھوڑی دیر کے لیے اندر گیا اور پھر واپس آکر عبدالعزیز کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا، "جناب بسم اللہ کیجیے۔"

عبدالعزیز نے کہا "یوسف میاں! آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ مہمان کون ہیں"؟

"چچا جان! مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جن کے قاصد بن کر آئے ہیں وہ کوئی اچھے ہی لوگ ہوں گے۔"

"بھئی بعض باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ ہمارے خاندان میں تم بہت مشہور ہو چکے ہو اور مجھے یہ کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ اپنے علاقے کے مشہور ڈاکو کو پکڑنے والا یوسف وہی نوجوان ہے جس نے میری ایک کم سن بھتیجی اور اس کی نانی کے ساتھ کوئٹہ سے امرتسر تک کا سفر کیا تھا۔ اصل میں ہم پولیس والے نیکیوں سے زیادہ برائیوں کا تعاقب کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ نسرین جسے تمہاری وجہ سے گھر میں سب اب شہزادی نسرین کہنے لگ گئے ہیں سے میں نے یہ واقعات اس وقت سُنے تھے جب تمہارے ضلع سے میری تبدیلی ہو چکی تھی لیکن تمہارا نام سنتے ہی مجھے یہ سمجھ جانا چاہیے تھا کہ اپنے گاؤں کے قریب ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے والا اور گاؤں سے دُور ہمارے خاندان کی ایک بزرگ عورت اور ایک کم سن بچّی کی مدد کرنے والا یوسف ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے۔ نسرین ایک ذہین بچّی ہے اگر میں اس سے تمہارا حلیہ پوچھ لیتا تو بھی مجھے سب کچھ معلوم ہو جاتا، لیکن یہاں بھی مجھے اپنی بھتیجیوں کا ہی شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھیں اتنی سمجھ تھی کہ انھوں نے تمہارے پرنسپل کو خط لکھ کر تمہارے بارے میں معلوم کر لیا۔"

یوسف کے دل میں اگر ناشتے کی کوئی خواہش تھی تو وہ دور ہو چکی تھی۔ اُس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "چچا جان میں یہ بیان نہیں کر سکتا کہ جو مہمان آپ کے گھر میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں امی جان اُن کو مل کر کتنا خوش ہوں گی۔ آپ

راستے میں ان کا ذکر نہ کریں کہ وہ کون ہیں اور پھر اگر آپ تعارف نہ بھی کروائیں تو وہ پہلی نظر میں ہی انھیں دیکھ کر پہچان لیں گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ کشادہ گلی میں ایک تانگے پر سوار ہو رہے تھے۔

عبدالعزیز کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور جب یوسف اپنی والدہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر اُس کے ساتھ بیٹھنے لگا تو ایک نئی کار ہارن بجاتی ہوئی تانگے کے قریب آ کر رُک گئی۔ چلانے والی امینہ تھی۔ اس کی والدہ ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور ڈرائیور پچھلی سیٹ پر تھا۔

یوسف نے پریشان ہو کر دبی آواز میں کہا۔" انکل ایک مسئلہ پر مجھے آپ کی ضرورت پڑے گی۔"

"کیا مسئلہ ہے یوسف صاحب"

"یہ آپ کو ابھی پتہ چل جائے گا۔"

یوسف نے آگے بڑھ کر رشیدہ کو سلام کیا اور پھر امینہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"آپ کو نئی کوٹھی مبارک ہو۔"

"جناب ہم آپ کو وہاں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ آپ کی دعوت آج بھی ہے"

"نہیں جی دعوت کل ہے۔"

"جی کل بھی ہے اور آج بھی۔"

یوسف نے رشیدہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "چچی صبح میرے انکل آگئے تھے اور ہم ان کے ساتھ ان کے بال بچوں کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ انشاءاللہ کل ہم آپ کی کوٹھی اچھی طرح دیکھ لیں گے اور شاید میرے ساتھ میرے کچھ دوست بھی آئیں۔"

امینہ بولی "اچھا تو جناب آپ ہمارے ساتھ کار میں بیٹھ جائیے پہلے ہم وہاں جائیں

گے۔ جہاں آپ کے انکل آپ کو لے جانا چاہتے ہیں اور پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

"دیکھو امینہ! ان کے گھر بہت سے مہمان آئے ہوتے ہیں اور ہمیں کافی دیر وہاں رکنا پڑے گا اور جس علاقہ میں یہ تانگہ جا سکتا ہے وہاں آپ کی گاڑی نہیں جا سکے گی۔"

وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ یوسف جلدی سے تانگے میں بیٹھ گیا اور عبدالعزیز نے کوچوان سے کہا "بھئی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

اور اُس کی آواز اتنی گرجدار تھی کہ امینہ سہم کر رہ گئی۔

قدسیہ نے بلند آواز میں کہا "بہن رشیدہ بُرا نہ ماننا بھائی جان کے ساتھ میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

اور تانگہ پوری رفتار کے ساتھ چل پڑا۔

امینہ نے حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوتے کہا "امی یہ کیسا انکل ہے یوسف صاحب کا۔"

"چلو بیٹی انکل ایسے ہی ہوتے ہیں جب موقع ملے گا تو پوچھ لیں گے۔"

تانگے پر عبدالعزیز نے یوسف سے کہا۔" یوسف وہ صاحبزادی کون تھیں جو میری طرف خونخوار آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔"

"انکل یہ میاں عبدالکریم کی صاحبزادی ہے جسے ارجن سنگھ ڈاکو نے لُوٹنے کی کوشش کی تھی اور ان کا مسئلہ یہ ہے کہ لاہور میں عبدالکریم صاحب نے نئی کوٹھی بنائی ہے جو وہ ہمیں دکھانا چاہتے ہیں اور یہاں ایک شاندار دعوت کا کئی دن سے ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ اطلاع بہت پہلے مل چکی تھی کہ صاحبزادی بذاتِ خود ہمیں لینے کے لیے آئیں گی۔"

عبدالعزیز نے کہا "بیٹا! میری وجہ سے تمہارا پروگرام خراب نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہمارا اُن کے ساتھ۔ امی جان سے پوچھ لیجئے۔"

عبدالعزیز نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا "بہن میرا نام عبدالعزیز ہے اور آپ کے ہونہار فرزند سے میری دوستی اُس وقت ہوئی تھی جب یہ ایک بہت بڑے ڈاکو کو پکڑ چکے تھے۔"

قدسیہ نے کہا "بھائی جان! مَیں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یوسف اکثر آپ کا ذکر کیا کرتا ہے۔ یوسف کے ابا جان دورے پر گئے ہوتے ہیں ورنہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوتے۔ بھائی جان یوسف آج بڑا خوش ہے۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"آپا جی! آپ میرے گھر جا رہے ہیں جہاں بہت پیار کرنے والے لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

قدسیہ نے باقی راستہ میں کوئی بات نہ کی۔ اُس کے دل میں جو سوال اُٹھ رہے تھے ان کا جواب وہ یوسف کے چہرے پر تلاش کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تانگہ ایک مکان کے دروازے پر رُکا، یوسف نے ماں کو سہارا دے کر اُتارا اور عبدالعزیز نے کہا "بھابی جی آپ بلا تکلف تشریف لے جائیں: وہاں میری بیوی، ایک نوکرانی اور اُن مہمانوں کے سوا کوئی نہ ہو گا جو بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"یوسف تم بھی جاؤ۔ مجھے ایک کام ہے مَیں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال تم نے اور بھابی جان نے شام تک یہیں رہنا ہے۔ کیونکہ رات کی گاڑی پر وہ مہمان جو صرف بھابی جان کی خاطر آتے ہیں واپس چلے جائیں گے۔"

قدسیہ بیگم نے کہا۔ آپ یہ کیوں نہیں بتا دیتے کہ مہمان کون ہیں۔"

"بھابی جان اندر چلئے نا۔"

"آیئے امی جان" یوسف نے کہا۔

کشادہ صحن کے اندر جامن اور پیپل کے درختوں کی چھاؤں میں تین عورتیں کھڑی تھیں۔

قدسیہ نے پہلی نظر میں ہی معمر لیکن خوش وضع خاتون سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ مسز احمد ہوں گی۔ اگرچہ یہاں دیکھ کر آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔" وہ بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی اور پھر وہ دوسری خاتون کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ نسرین اور فہمیدہ کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتیں۔"

اُس نے تیسری خاتون کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ بھائی عبدالعزیز صاحب کی زیادتی ہے کہ انہوں نے اندر بھیجتے ہوئے مجھے آپ کا نام نہیں بتایا۔ مَیں نے آپ کو شاید ٹھیک طرح السلام علیکم بھی نہیں کیا۔ بہن صفیہ مجھے اچھی طرح جھنجھوڑ کر بتاؤ کہ یہ سب کچھ ایک خواب نہیں۔ یہ چند دن کی بات ہے کہ مَیں نے یوسف سے کہا تھا کہ شاید میں آپ لوگوں کو نہیں دیکھ سکوں گی اور آج میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھتی ہوں۔"

قدسیہ مسکرا رہی تھی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

صفیہ نے پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلئے بہن۔ اندر چلئے۔"

وہ کشادہ کمرے میں بیٹھ گئیں۔

نوکرانی نے شربت سے بھرے ہوئے دو جگ لا کر میز پر رکھ دیے اور صفیہ نے دو گلاس بھر کے قدسیہ اور یوسف کو پیش کر دیئے۔

یوسف نے اُٹھ کر کہا "خالہ جان! آپ تشریف رکھیں" اور وہ گلاس جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ آگے بڑھ کر مسز احمد کو پیش کر دیا۔

اِس کے بعد اُس نے صفیہ کو ایک گلاس بھر کر پیش کیا۔ پھر وہ عبدالعزیز کی بیوی کی طرف متوجہ ہوا تو اُس نے کہا "بیٹا! اب تم اپنی امی جان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ جب تک تم پانی نہیں پیو گے اس وقت تک وہ اپنے منہ کو گلاس نہیں لگائیں گی۔"

یوسف جلدی سے ایک گلاس بھر کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

صفیہ اپنی امّی جان سے کہہ رہی تھی یہ شربت تو میں کئی بار پی چکی ہوں، لیکن آج کچھ زیادہ ہی میٹھا ہو گیا ہے کیوں بہن قدسیہ یوسف کے خالی پانی میں آپ کو مٹھاس محسوس نہیں ہوتی۔"

عبدالعزیز کی بیوی بلقیس نے ایک گلاس بھر کر دوسرے کمرے کا رُخ کرتے ہوئے مہمانوں کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا "آپا قدسیہ آپ کی ذہانت کا امتحان لینا ہے تو گستاخی لیکن ہمارے گھر میں ایک بچی ایسی ہے جسے یہ جان کر بڑی خوشی ہو گی کہ آپ نے اُسے بھی دیکھتے ہی پہچان لیا ہے۔"

جب وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی تو یوسف نے اٹھ کر کہا "امی جان آپ اطمینان سے باتیں کریں میں یہاں پاس ہی ایک دوست سے مل کر آتا ہوں۔"

مسز احمد نے کہا "یوسف اِدھر آؤ۔"

یوسف اُن کے قریب کھڑا ہو گیا "فرمائیے ماں جی۔"

"میں اب بھی تمھیں کوئی حکم دینے کا حق رکھتی ہوں نا؟"

یوسف نے جواب دیا "ماں کا یہ حق ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔"

"اچھا میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

یوسف نے اُس کے دائیں ہاتھ بیٹھ کر سر جھکا لیا۔

وُہ بیگم عبدالعزیز کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی اور اس کے قریب سے گذر گئی۔

قدسیہ اُٹھی اور جلدی سے آگے بڑھ کر اُس سے لپٹ گئی "فہمیدہ! میری پیاری بیٹی۔ بیٹی تم وہی ہو جسے میں سوتے جاگتے ہر وقت دیکھا کرتی تھی۔" پھر وہ اُس کے سرخ و سفید گالوں، بڑی بڑی چمکدار آنکھوں اور پیشانی کو چوم رہی تھیں:

"بیٹی خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو چکی ہے۔ مجھے اس بات سے خوف آتا تھا کہ میں تمہیں ملے بغیر رخصت نہ ہو جاؤں۔ بہت خوف آتا تھا مجھے اس بات سے۔ بیٹھ جاؤ میرے پاس۔"

قدسیہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی

یوسف اٹھا اور کمرے سے برآمدے میں چلا گیا۔ صفیہ نے اس کی طرف دیکھا تو وُہ منہ پھیر کر آنسو پونچھنے لگا۔ صفیہ جلدی سے باہر نکلی اور پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "بیٹا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جب یوسف سے ملاقات ہو گی تو میں اسے غمگین دیکھوں گی۔"

"خالہ جان!" یوسف نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "خدا معلوم امی جان ایسی باتیں کیوں کہہ رہی تھیں۔ انھیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ کسی دن ہمارا ساتھ چھوٹ جائے گا اور وہ دنیا جس کے متعلق فہمیدہ نے یہ لکھا تھا کہ میں یہاں خوشیاں تقسیم کرنے آیا ہوں ایک ویرانہ بن جائے گی۔ فہمیدہ کو دیکھ کر وہ یقیناً بہت خوش ہوئی ہیں لیکن ایسے موقعوں پر وہ خوشی اور غم کی سرحدوں کے درمیان فاصلے قائم نہیں رکھ سکتیں۔ وہ پورے خاندان میں سب سے زیادہ تندرست ہیں اور ان میں قوت برداشت بھی بہت ہے۔ میں جس کی ہر بات پر وُہ فخر کرنے

کی عادی ہیں اُن کے لیے ایک کمزوری بھی بن چکا ہوں۔ اِس لیے کہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں یا شاید اس لیے کہ میں اُن سے بہت پیار کرتا ہوں۔ خالہ جان مجھے یقین ہے کہ اگر فہمیدہ کوئی ہنسنے والی بات کر دے تو تھوڑی دیر بعد آپ کو اس کمرے میں اُن کے قہقہے سنائی دیں گے۔

خالہ جان! نسرین کیوں نہیں آئی آپ کے ساتھ؟"

"بیٹا! بات یہ ہے کہ ہم پرسوں کانگڑہ جا رہے ہیں۔ وہاں ہم چند ہفتے دھرم سالہ ٹھہریں گے۔ ہم صرف تمہاری امی سے ملنے کے لیے لاہور آئے تھے کیونکہ فہمیدہ نے اب کالج میں داخل ہونا ہے۔ اس کے بعد خدا معلوم کب اسے لاہور آنے کا موقع ملے۔ اس لیے ہم اسے ساتھ لے آئے۔ نسرین سے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ چھٹیاں ختم ہونے سے چند روز پہلے اُسے ہم اُس کے چچا کے ہاں بھیج دیں گے اور پھر وہ روزانہ آپ کے ہاں آجا سکے گی اور اگر وہ آپ کی امی کے پاس رہنا پسند کرے تو ہمیں اس بات کی بھی خوشی ہوگی۔ اِن سب کو تمہارے "پردیسی درخت" دیکھنے کا بہت شوق تھا اور ہمارے پہلے پروگرام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اگر تمہارے گاؤں کا پتہ چل گیا تو ہم آتے جاتے وہاں ایک دو دن ضرور ٹھہریں گے لیکن آپ کے خط سے پتہ چلا کہ آپکے والد لاہور تبدیل ہو چکے ہیں پھر امی جان اچانک جالندھر تشریف لے آئیں۔ اصل مقصد تو ہمیں کانگڑہ کی طرف رخصت ہوتے وقت دیکھنا تھا لیکن پھر اچانک ایک دن ان کا موڈ بدلا اور وہ ہمیں اپنے ساتھ یہاں لے آئیں۔ اب پروگرام یہ ہے کہ میں اور فہمیدہ جالندھر اُتر جائیں گے اور امی جان اسی گاڑی پر لدھیانہ پہنچ جائیں گی۔"

"خالہ جان! انہوں نے ہمارے لیے اتنی تکلیف کی ہے اگر انھیں گھر ہی واپس جانا ہے تو چند دن ہمارے ہاں ٹھہر جائیں۔ میری امی جان خوش ہو جائیں گی۔"

"نہیں بیٹا اگر وہ ایک دفعہ فیصلہ کر لیں تو اسے تبدیل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تمہاری امی جان کو خوش کرنے کے لیے میں فہمیدہ کو کہوں گی کہ اُنھیں ہر ہفتہ ایک خط ضرور لکھا کرے۔ ہاں تمہارے لیے مَیں کچھ تصویریں لائی ہوں۔ نسرین کہتی تھی "امی جان یہ تصویریں بھائی یوسف کی امی کے ہاتھ میں دینا ورنہ وہ کہیں گم کر دیں گے"۔

کمرے سے ایک خوشگوار سا قہقہہ سنائی دیا اور یوسف صفیہ کے ساتھ اندر آگیا۔

فہمیدہ جو لجاتی شرماتی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ابھی تک نصف چہرہ دوپٹے سے چھپائے بیٹھی تھی۔

قدسیہ نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! کتنے خوب صورت ہیں تمہارے ہاتھ۔ اگر میرے پاس الہ دین کے چراغ کا جن ہوتا تو اسے حکم دیتی کہ میرے سامنے اشرفیوں کا انبار لگا دو جو میری بیٹی فہمیدہ کے قد کے برابر اونچا ہو اور پھر میں بھائی عبدالعزیز سے درخواست کرتی کہ وہ اس علاقے کے تمام غریبوں کو جمع کر لیں کیونکہ میں فہمیدہ کے خوب صورت ہاتھوں سے یہ اشرفیاں اُن میں تقسیم کروانا چاہتی ہوں۔"

اِس پر سب ہنس پڑے اور ان کے ساتھ فہمیدہ کے دبے دبے خوشگوار قہقہے بھی سنائی دینے لگے۔ مسز احمد نے کہا۔ "بیٹا یوسف! ہم تو کوئی اور ہی پروگرام لے کر آئے تھے لیکن تمہاری امی جان کو دیکھ کر مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ تمہارے ساتھ چلیں گے اور مَیں ان کے ساتھ اس لیے کانگڑا جانے پر تیار ہو گئی تھی کہ مَیں وہاں اطمینان سے تمہاری زبان سے وہ دلچسپ واقعات سننا چاہتی تھی جو مجھے عبدالعزیز سے معلوم ہوتے یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں مَیں اور میری بیٹیاں یہ دعا کیا کرتی تھیں

کہ کہیں سے تمہاری اطلاع آجائے تو عبدالعزیز کو تمہارے اور تمہارے خاندان کے متعلق ایک ایک بات معلوم تھی۔ ڈاکوؤں کے ساتھ تصادم کے جو واقعات اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ فہمیدہ نے اپنے چچا سے اصرار کر کے اُن کے پرانے پرچے منگوا کر ایک اچھی خاصی فائل تیار کر لی تھی۔"

"ماں جی یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے ایک نیک کام میں میری مدد کی تھی۔"

"کیوں بیٹی صفیہ فہمیدہ نے یہی کہا تھا نا کہ جب میں یوسف کی تعریف کروں گی تو وہ بے پروائی سے یہ کہے گا: ماں جی یہ کون سی بڑی بات تھی۔"

تھوڑی دیر بعد حویلی کا پھاٹک کھلنے کی آہٹ سنائی دی اور بلقیس نے باہر جھانکتے ہوئے کہا، "شاید وہ آگئے ہیں۔" پھر وہ اُٹھ کر باہر جھانکتے ہوئے بولی: "وہ اس طرف آنے کی بجائے بیٹھک کی طرف چلے گئے ہیں۔"

یوسف نے اُٹھتے ہوئے کہا "میں اُن کے پاس جاتا ہوں۔"

مسز احمد نے قدسیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بہن اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کھانے کے لیے انھیں یہیں بلا لیا جائے۔"

"آپا جی! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ فہمیدہ کا چچا ہی نہیں میرا بھائی بھی ہے۔ اور اگر وہ میری وجہ سے اتنی دیر گھر سے باہر رہے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہونا چاہیے۔"

صفیہ نے کہا "میں انھیں بلا لاتی ہوں۔" وہ کمرے سے نکل کر بیٹھک کی طرف چلی گئی۔ دس منٹ بعد وہ واپس آئی اور اُس نے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ جب کھانا لگ جائے گا تو ہم آجائیں گے۔" —— پھر اُس نے آواز دی:

"فہمیدہ بیٹی وہ یہ کہتے ہیں کہ تمہاری چچی کی کار ورکشاپ سے مرمت ہو کر آجائے گی۔ اب کھانے کے بعد تمہیں دو تین گھنٹے لاہور میں گھومنے کے لیے مل جائیں گے۔"

"امی جان! دوپہر کے کھانے کے بعد سیر تو ایک سزا ہو گی۔"

بلقیس نے کہا۔ "بیٹی یہ ضروری تو نہیں کہ تم دھوپ میں ہی سیر کرو۔ ہم چار بجے کے قریب گھر سے نکلیں گے پھر اطمینان سے سیر کریں گے۔ لارنس گارڈن میں تو ہم رات کے دس بجے تک گھوم سکتے ہیں۔ پھر علی الصبح شاہی مسجد قلعہ اور جہانگیر کا مقبرہ دیکھ سکیں گے۔"

مسز احمد نے کہا "بیٹی رات ہمیں جالندھر پہنچنا ہے۔"

قدسیہ نے کہا۔ "دیکھیے آپا جان جالندھر سے آپ کو کانگڑہ جانا ہے اور وہاں اگر ہماری خاطر تاخیر سے چلی جائیں تو کیا نقصان ہو گا۔ خدا کے لیے مجھے یہ تو یقین آنے دیجیے کہ میں نے خواب نہیں دیکھا۔ اب پروگرام یہ ہے کہ شام کو سیر کرنے کے بعد آپ سب میرے ہاں کھانا کھائیں گے اور رات وہیں رہیں گے۔ علی الصبح پھر ہم سیر کے لیے نکلیں گے اور کسی جگہ ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ ناشتہ ہم ساتھ لے جائیں گے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت ہم گھر پہنچ جائیں گے۔ پھر ہم سب آپ کو اسٹیشن پر جا کر رخصت کریں گے۔ ویسے آپ یوسف کی طرح مجھے بھی حکم دے سکتی ہیں اور ڈانٹ کر یہ کہہ سکتی ہیں؛ لڑکی تم خاموش رہو اور میں خاموش ہو جاؤں گی۔"

مسز احمد نے گھبرا کر کہا۔ "قدسیہ بیٹی دیکھو کہیں پھر نہ رو پڑنا۔ میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کروں گی جو تمہیں پسند نہ ہو۔"

قدسیہ مسکرائی۔

مسز احمد نے کہا۔ "بیٹی! اسی طرح مسکراتی رہا کرو، تمہارے چہرے پر مسکراہٹ

بہت اچھی لگتی ہے"۔

قدسیہ نے فہمیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیوں فہمیدہ بیٹی تمہیں بھی میری مسکراہٹ اچھی لگتی ہے"؟

"جی خالہ جان"

"بیٹی تم اس بات پر ناراض تو نہیں ہوگئی، میں نے تمہاری نانی جان کو پروگرام تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے"؟

فہمیدہ نے جواب دینے کی بجائے قدسیہ کی طرف دیکھا اور ایک دائمی مسکراہٹ جو اکثر اس کے ہونٹوں پر دیکھی جاتی تھی اس کے چہرے پر آنکھوں تک پھیل گئی اور اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

قدسیہ نے کہا "بیٹی کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ہزاروں دعاؤں کے بعد تمہاری نانی، تمہاری امی اور تم ملی ہو اور مجھے اِس سے زیادہ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ مجھے ایک ہفتہ نہیں ایک مہینہ اور کہنا چاہیے تھا۔

وُہ ہنس پڑیں۔

صفیہ بولی "آخر تم ایک ادیب کی ماں ہو نا"۔

فہمیدہ نے کہا "خالہ جان جالندھر یا لدھیانہ یہاں سے بہت دُور تو نہیں ہے"۔

"بیٹی اب دُور نہیں ہیں کل تک تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نہ ختم ہونے والے فاصلوں میں گم ہوکر رہ جاؤں گی"۔

بیٹھک میں عبدالعزیز یوسف سے کہہ رہا تھا "دیکھو بھائی مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ جب تمہیں فرصت ملا کرے گی تو تم سیدھے یہاں آجایا کرو گے ہم میں سے کوئی گھر میں ہو یا نہ ہو تمہارے ٹھہرنے کا انتظام یہاں ضرور ہوا کرے گا۔ میرا چھوٹا بھائی کمال الدین

کالج میں داخل ہوا تھا تو اس وقت اِس مکان میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ بھابی صفیہ اور ان کی بچیاں بھی یہاں آجایا کرتی تھیں۔ فہمیدہ اور نسرین کے ساتھ تو ہم میاں بیوی اتنے مانوس تھے کہ کسی نہ کسی بہانے جالندھر چلے جایا کرتے تھے۔ کمال الدین میڈیکل کالج سے فارغ ہوکر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلا گیا ہے تو ہمیں اس گھر میں پاؤں رکھتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔

یوسف نے جھجکتے ہوئے پوچھا "چچا جان! آپ کے بچے کہاں ہیں"؟

"بھائی"! اس نے جواب دیا "اللہ نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا ہے اور میں تمام اچھے بچوں پر ایک باپ کا پیار تقسیم کرتا رہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اُس میں سے تم بھی ایک بڑا حصہ لے چکے ہو۔ میں کسی بچے کی جن اچھائیوں کا تصور کیا کرتا تھا وہ سب مجھے تم میں نظر آتی ہیں اور وہ بھی نظر آتی ہیں جن کا تصور میں نہیں کیا کرتا تھا۔ مثلاً میں تمہیں گاؤں کے ایک بہادر آدمی، ایک بہترین شہسوار اور ایک نڈر اور ذہین نوجوان کی حیثیت سے جانتا تھا۔ پھر نسرین اور اس کی نانی سے معلوم ہوا کہ تم تیراک بھی ہو اور کشتی کھینا بھی جانتے ہو اور فہمیدہ کا یہ دعویٰ ہے کہ تم اپنے قلم سے اپنے لیے بڑی سے بڑی کامیابی کے راستے کھول سکتے ہو، اچھا یہ بتاؤ تمہیں کار چلانا بھی آتی ہے"؟

"نہیں چچا جان کار چلانا گاؤں والوں کی ضرورت نہیں ہوتی"۔

"لاہور گاؤں نہیں ہے یوسف تمہارے جیسا آدمی جسے کشتی تک چلانی آتی ہو وُہ تین چار دن میں اچھا خاصا موٹر ڈرائیور بن جائے گا"۔

"چچا جان جب میں موٹر لینے کے قابل ہوجاؤں گا تو چلانا بھی سیکھ لوں گا"۔

"بھئی چلانا سیکھ لوگے تو موٹر بھی آجائے گی۔ آج تھوڑی دیر تک بلقیس کی کار یہاں آئے گی اور ڈرائیور کو یہ کہوں گا کہ وہ ایک ہفتہ کے لیے دو تین گھنٹے روزانہ تمہیں دیا کرے۔ بڑا تجربہ کار ہے وہ۔ اور جب اسے یہ بتایا جائے گا کہ اسے ایسے نوجوان کا اُستاد بنایا جارہا ہے جس نے ایک انتہائی خوفناک ڈاکو پکڑا تھا۔ جس کے نام سے

بڑے بڑے بدمعاش کانپتے تھے تو وہ بہت خوش ہوگا۔"

یوسف نے کہا "نہیں چچا جان آپ کو اِس سے تکلیف ہوگی۔"

"بیٹا مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی تم جانتے ہو کہ میں اپنے لیے سائیکل پسند کرتا ہوں" یہ کار بلقیس کو تین سال قبل اس کے والد نے دی تھی۔ پھر وہ بھی اسے کم ہی استعمال کرتی ہے، بلکہ اُس نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ "ہم تو ڈرائیور کے اخراجات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے" اس پر اُس کے ابا جان نے ڈرائیور کی تنخواہ اپنے ذمے لے لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بات پر خوش ہوں گی کہ آپ نے اُن کے ڈرائیور سے کار چلانا سیکھی ہے۔ بلکہ وہ اُسے انعام بھی دیں گی۔"

یوسف نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نماز کے لیے مسجد تک جا رہا ہوں۔"

عبدالعزیز نے اُٹھتے ہوئے کہا "چلو میں بھی چلتا ہوں۔"

جب وہ باہر نکلے تو برآمدے سے صفیہ کی آواز سنائی دی۔ "بھائی جان کھانا تیار ہے۔"

عبدالعزیز نے جواب دیا۔ "ہم نماز پڑھ کر آتے ہیں۔"

قدسیہ نے ایک کمرے میں ظہر کی نماز ادا کی اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ فہمیدہ اُس کے بائیں ہاتھ کھڑی ہے۔ وہ دُعا ختم کرکے اُٹھی، چند ثانیے اُس کے پیچھے کھڑی رہی اور پھر ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اسے قیام اور رکوع و سجود تک فہمیدہ کی ہر بات انوکھی معلوم ہوتی تھی اور اُس کے دل سے بے اختیار یہ دعائیں نکل رہی تھیں:

"یا اللہ اس بچی کا حُسن اور اِس کی پاکیزگی اسی طرح قائم رہے۔

اِسے اپنی نعمتوں سے مالامال کردے۔ یا اللہ اِس کے والدین اِس کی اَن گنت خوشیاں دیکھیں۔ یا اللہ مجھے اتنی زندگی دے کہ مَیں یوسف اور اِس بچّی کے لیے جی بھر کر دعائیں کرسکوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ سب دستر خوان پر بیٹھے ہوتے تھے اور صفیہ کہہ رہی تھی:

"آپا قدسیہ آپ کے آنے کی خوشی میں مَیں باورچی خانے کی طرف توجہ نہیں دے سکی ویسے ہماری باورچن مہمانوں کی شکل دیکھ کر ہی سمجھ جاتی ہے کہ وہ کس قسم کا نمک مرچ پسند کریں گے۔"

اور قدسیہ کہہ رہی تھی۔ "پھر تو ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہمیں اچھے مہمانوں میں شامل کرلیا ہے۔"

خادمہ نے کہا۔ "جی بی بی جی آپ سے اچھا کون ہوسکتا ہے۔"

"واہ بھئی تمہاری بریانی کا تو کوئی جواب نہیں۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

خادمہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "جی میرا نام فضلاں ہے۔"

قدسیہ نے کہا "اگر ہمیں کسی دن خاص لوگوں کو دعوت پر بلانا پڑا تو مَیں بہن بلقیس سے درخواست کروں گی کہ تمہیں ایک دن ہمارے گھر آنے کی چھٹی مل جائے۔"

بلقیس بولی "خدا کا شکر ہے کہ تمہیں فضلاں کا کھانا پسند آیا ہے۔ اب پ کو جب بھی ضرورت پڑے گی یہ آپ کے پاس پہنچ جایا کرے گی۔"

کھانے سے فارغ ہوکر قدسیہ نے عبدالعزیز سے مخاطب ہوکر کہا "بھائی جان! پ ڈرائیور سے کہیں کہ مجھے گھر چھوڑ آئے۔ مَیں نے نوکر کو شام کے کھانے کے لیے ہدایات دینی ہیں۔"

بلقیس بولی۔ "بہن کچھ دیر آرام کرلو، بہت گرمی ہے۔ کھانا پکانے کے لیے

میں فضلاں بی بی کو آپ کے ساتھ بھیج دوں گی۔"

"بہن یہ تو بڑی اچھی بات ہو گی۔ شاید فضلاں کی وجہ سے ہمارے نوکر کو کچھ عقل آجائے۔ وہ خواہ کوئی چیز پکائے ذائقہ بالکل ایک ہوتا ہے۔ میں تین بجے یہاں سے چلی جاؤں گی۔

یوسف یہیں رہے گا اور چار بجے آپ کے ساتھ وہاں آجائے گا۔ وہاں چائے پی کر ہم چڑیا گھر اور لارنس گارڈن جائیں گے۔ باقی لاہور دیکھنے کے لیے ہم صبح نماز پڑھتے ہی نکل جائیں گے۔"

مسز احمد نے کہا۔"بیٹی میں نے چڑیا گھر، لارنس گارڈن اور باقی لاہور دیکھا ہُوا ہے۔"

"جی وُہ مَیں نے بھی دیکھا ہُوا ہے۔ یوسف نے لاہور پہنچتے ہی مجھے خوب سیر کرائی تھی۔"

عبدالعزیز نے کہا۔"بھئی اصل بات یہ ہے کہ لاہور کے پروگرام کا تعلق فہمیدہ سے ہے۔ بچپن میں جب یہ یہاں آیا کرتی تھی تو اِس کا پہلا مطالبہ یہ ہوا کرتا تھا کہ مجھے چڑیا گھر لے چلو۔ پروگرام آج بھی یہی تھا کہ صبح ہوتے ہی میں اِسے چڑیا گھر دکھلاؤں لیکن مجھے یوسف صاحب کی تلاش میں جانا پڑا۔"

قدسیہ نے کہا"بھائی جان ہمیں یقین ہے کہ آج ہمیں دیکھ کر فہمیدہ کو چڑیا گھر جانے سے زیادہ خوشی ہوئی ہو گی۔"

فہمیدہ نے مسکراتے ہوئے سر نیچے کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد قدسیہ نے اُٹھ کر اپنے سر پہ چادر لیتے ہوئے یوسف سے کہا۔"تھوڑی دیر آرام کر لیں تو اطمینان سے انھیں لے کر آجانا۔ مجھے ابھی خیال آیا ہے کہ وہ کوٹھی والے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور اگر تمہارے ابا جان ہمارے

گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ڈیرے سے واپس آگئے ہونگے تو انھوں نے انھیں بہت پریشان کیا ہو گا۔

"یہ کوٹھی والے کون ہیں بہن۔"

"انھیں بھائی عبدالعزیز جانتے ہیں۔ آؤ فضلاں بی بی۔"

وُہ سب قدسیہ کو رخصت کرنے کے لیے باہر نکلے۔

"دیکھئے جی باہر بہت گرمی ہے۔ آپ آرام سے بیٹھی رہیں۔"

عبدالعزیز نے کہا۔"آپا جی یہ آپ کو روانہ کرنے سے پہلے آرام نہیں کریں گی اگر ایک دوسرے کے آرام کا اتنا خیال ہے تو وہ باتیں جو عورتیں رخصت ہوتے وقت دروازے سے باہر کیا کرتی ہیں وہ یہاں برآمدے میں ہی کرلیں۔ مَیں نے ڈرائیور کو سمجھا دیا ہے وہ سیدھا آپ کو آپ کے گھر لے جائے گا۔"

"اچھا جی جاتی ہوں خدا حافظ۔"

قدسیہ یہ کہہ کر تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھی اور بلا توقف کار میں سوار ہو گئی۔

فضلاں بھی بھاگ کر اُس کے ساتھ جا بیٹھی اور ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

وہ سب چند قدم دُور کھڑی ہنستی ہوئی ہاتھ ہلا رہی تھیں اور قدسیہ اپنا ہاتھ باہر نکال کر اُن کے اشاروں کا جواب دے رہی تھی۔



کار عین مکان کے سامنے رُکی اور نوکر علی بخش نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔"بی بی جی آپ کہاں چلی گئیں تھیں۔ میاں جی آپ کے جاتے ہی آگئے تھے۔ وہ کھانا کھا رہے تھے تو عبدالکریم صاحب کا نوکر آگیا اور کہنے لگا کہ بی بی جی سے

کہو کہ میں ان کے لیے کار لے آیا ہوں۔ میاں جی نے پہلے بھی میری بہت مرمت کی
تھی۔ اب دوبارہ میری شامت آگئی اور وہ بار بار پُوچھتے تھے۔ بے وقوف تم نے اُن
سے یہ پوچھا کیوں نہیں تھا کہ وہ کہاں جارہی ہیں اور اس بدتمیز نوکر نے میرے لیے
ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی۔ جناب امینہ بی بی کہتی تھیں کہ جب صبح ہم انھیں
لینے آئی تھیں تو بیگم صاحبہ اور یوسف صاحب کسی آدمی کے ساتھ تانگے پہ جارہے
تھے۔ مجھ سے دوبارہ پوچھا جارہا تھا کہ اے گدھے مجھے بتاؤ کہ وہ آدمی کون تھا۔ مَیں نے
جواب دیا۔ جناب کوئی یوسف صاحب سے ملنے آیا تھا اور اس نے ناشتہ بھی
ان کے ساتھ کیا تھا اور وہ بدتمیز نوکر پھر بول اُٹھا۔ "میاں جی چھوٹی اور بڑی بی بی دونوں
یہ کہتی تھیں کہ وہ یوسف صاحب کا انکل تھا اور وہ اُس کے گھر جارہے تھے۔
میری پھر شامت آگئی اور مجھ سے پوچھا جارہا تھا وہ کون تھا جو یوسف کا انکل بن کر
آیا تھا۔ تم اتنے بے وقوف ہو کہ یہاں کوئی ہمارا ملنے والا آتے اور تم اسے پہچان بھی
نہ سکو۔ مجھے اُلو اور گدھا بھی کہا انھوں نے۔ یہ شکر ہے کہ میاں جی تھکے ہوئے تھے
انھیں کھانا کھاتے ہی نیند آگئی اور یہ بھی شکر ہے کہ آپ واپس آگئی ہیں ورنہ میری
جان پر بنی ہوئی تھی۔ ابھی میں اس بات سے ڈر رہا تھا کہ وہ عبدالکریم والے اگر ایک
بار پھر یہاں پہنچ گئے تو میرا کیا بنے گا۔"

"اچھا علی بخش تم فوراً قصائی کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہمارے خاص
مہمان آرہے ہیں ہمیں بہت اچھا چار سیر گوشت چاہیے۔ کھانا پکانے کے لیے
فضلاں بی بی آگئی ہے۔ تم نے آج اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرنا۔ جو چیزیں یہ مانگے اسے
بازار سے لا دینا اور تمھیں جلد واپس آکر چائے کے لیے کچھ چیزیں بھی لانی ہیں کیونکہ
مہمان چائے یہاں پئیں گے۔ چائے تم بہت اچھی بناتے ہو، اِس لیے میں فضلاں
کو تکلیف نہیں دوں گی۔"

قدسیہ اندر آگئی تو یہی شکایت یوسف کے بہن بھائی کر رہے تھے کہ آپ
ہمیں بتا کر کیوں نہیں گئیں۔ ابّا جان بہت غصّے میں تھے۔

لیکن وہ قطعاً پریشان نہ تھی۔ اُس نے بڑے کمرے میں جا کر دیکھا۔ میاں عبدالرحیم
بڑے آرام کی نیند سو رہے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد وُہ کام میں مصروف ہو چکی تھی۔
کچھ دیر بعد کار کا ہارن سنائی دیا اُس نے دروازہ کھولا اور کار سے یوسف کے ساتھ
صفیہ، فہمیدہ اور بلقیس اُتریں۔

قدسیہ نے پُوچھا۔ "بیٹا یوسف۔ بھائی عبدالعزیز اور مسز احمد نہیں آئے؟"

"جی عبدالعزیز صاحب کو اپنے دفتر میں کوئی کام تھا اور ماں جی کو تھکاوٹ اور
نیند محسوس ہو رہی تھی۔"

بلقیس بولی۔ "آپا جی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فہمیدہ کی موجودگی میں وہ میری
غیر حاضری محسوس نہیں کریں گی۔"

فہمیدہ بولی۔ "انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم سیر سے فارغ ہو جائیں تو
یوسف صاحب کو میرے پاس چھوڑ جائیں مجھے ان سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

قدسیہ انھیں بیٹھک میں لے گئی اور نوکر کو شربت لانے کا حکم دے کر
یوسف کی طرف متوجہ ہوئی۔ "بیٹا! میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ہمارے بعد تمہارے
ابا جان پہنچ گئے تھے اور عبدالکریم والوں نے نوکر کو موٹر دے کر بھیج دیا تھا۔ اب
وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ چائے سے فارغ ہوتے ہی باہر
نکل جاؤں۔"

بلقیس بولی۔ "بہن آپ فکرمند نہ ہوں۔ اگر آپ کو ایک اور حملے کا خدشہ ہے
تو ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔"

قدسیہ نے کہا۔ "بہن مجھے صرف ایک پریشانی ہے اگر وُہ اچانک

آگئیں تو کل دعوت میں ہماری شرکت سے معذرت قبول کرنے کی بجائے یہ اصرار کریں گی کہ آپ بھی دعوت میں شریک ہوں۔"

صفیہ نے کہا۔ "تو بہن اِس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ہم بڑی خوشی سے جائیں گی آپ کے ساتھ۔ یوسف صاحب کہتے ہیں کہ صاحبزادی کو اپنی نئی موٹر کار دکھا کر چلانے کا شوق ہے۔ ہم جی بھر کر ان کا یہ شوق پورا کریں گے۔"

"نہیں بہن۔" قدسیہ نے پریشان سی ہو کر کہا۔ "مَیں فہمیدہ کو اُس بے وقوف کے ساتھ کبھی بیٹھنے نہ دوں گی۔"

وہ چائے پی رہے تھے کہ دوسرے کمرے سے عبدالرحیم نے نوکر کو آواز دی۔

قدسیہ شربت کا گلاس بھر کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میاں صاحب کا موڈ کچھ اچھا نہیں تھا، لیکن ٹھنڈے شربت کا گلاس پینے کے بعد انھوں نے کہا۔ "قدسیہ تم سے اتنی غیر ذمہ داری کی توقع نہیں تھی۔ مَیں ساری زندگی اتنا پریشان نہیں ہوا۔ تم نے گھر میں کسی کو تو یہ بتا دیا ہوتا کہ کہاں جا رہی ہو۔"

قدسیہ چند ثانیے خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر وہ مسکرائی اور میاں صاحب کے سارے شکوے جاتے رہے۔

اچھا یہی بتا دو کہ وہ یوسف کے انکل صاحب کون تھے جن کے ساتھ تم تانگے پر سوار ہو کر نکل گئی تھیں اور وہ جو تمھیں کار پر لینے آئی تھی ایک دوسری کا منہ دیکھتے رہ گئیں۔"

"صغریٰ" قدسیہ نے آواز دی۔ "اپنے ابا کے لیے چائے لاؤ۔ آپ اطمینان سے چائے پیئیں۔ اُس انکل صاحب کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ بیٹھک میں

چند خاص قسم کی مہمان بیٹھی ہوئی ہیں۔ مَیں ابھی آتی ہوں۔"

صغریٰ نے چائے لا کر میاں صاحب کے سامنے رکھ دی اور انھوں نے پوچھا۔ "بیٹے! تم جانتی ہو مہمان کون ہیں۔"

"نہیں ابا جان! لیکن وہ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ ان کی ایک بیٹی تو بالکل شہزادی معلوم ہوتی ہے۔"

"اچھا بیٹی! اب یوسف کو بھیج دو۔"

صغریٰ چلی گئی اور ایک منٹ بعد یوسف کمرے میں داخل ہوا اور السلام علیکم کہہ کر ادب سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

میاں صاحب نے کہا۔ "بیٹا! مجھے تم پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ تم گھر میں کسی کو بتا کر نہیں گئے اور وہ تمہارا انکل کون تھا جس نے مجھے اور مجھ سے زیادہ عبدالکریم کے خاندان کو پریشان کیا ہے۔"

یوسف مسکرایا۔ "ابا جان! وہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب تھے اور عبدالکریم صاحب بھی انھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جن کی ایک بزرگ خاتون اور ایک بچی کے ساتھ ۱۹۴۲ء کے سیلاب کے دنوں مَیں نے کوئٹہ سے امرتسر تک سفر کیا تھا۔ وہ صبح سویرے مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے اور انھوں نے یہ بتایا کہ وہ معزز خاتون ان کے ہاں میرا انتظار کر رہی ہے۔ ہمیں فوراً اُن کے ساتھ جانا پڑا۔ تانگے پر نکلے تو عبدالکریم کی بیٹی اور بیگم سے سامنا ہو گیا۔ وہ ہمیں کوٹھی دکھانے کے لیے لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اُن سے معذرت کر لی جائے۔"

"بیٹا! یہ تم نے اچھا کیا۔ جس معزز خاتون کو تم نے ماں کہا تھا اُس کے لیے ہر پروگرام منسوخ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کسی کو بتا کر گئے ہوتے نا۔"

"ابا جان ہم گھر سے کچھ دُور آ چکے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ ان کے خاندان کے لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"عبدالعزیز صاحب تمہارے ساتھ نہیں آئے۔"

"ابا جان! وہ کچھ مصروف تھے۔ انشاء اللہ آپ سے ملا کریں گے۔"

"بیٹا اپنی ماں سے پوچھو اُن کی خاطر تواضع کا بھی کوئی انتظام ہو رہا ہے کہ نہیں۔"

"ابا جان! کل تک وہ امّی کے مہمان ہیں اور امّی جان ان کا کھانا تیار کرنے کے لیے انسپکٹر صاحب کی باورچن کو بھی یہاں لے آئی ہیں۔"

عبدالرحیم نے اُٹھ کر اُسی کمرے میں عصر کی نماز ادا کی اور نوکر نے حقہ لا کر سامنے رکھ دیا۔

قدسیہ جس نے فہمیدہ کا بازو پکڑ رکھا تھا صحن کی طرف سے نمودار ہوئی اور اُس نے دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر کہا "یوسف کے ابا۔ دیکھئے یہ کون ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "کیا یہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب کی بیٹی ہے؟"

بیٹی نہیں۔ یہ بھتیجی ہے۔ بہت ہی لاڈلی۔ بہت ہی پیاری بھتیجی۔ اب آپ یہ بتلایئے کہ مجھے ایسے مہمانوں سے نظر ہٹا کر کسی اور طرف ایک منٹ کے لیے بھی توجہ دینی چاہیے تھی۔"

بالکل نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے گھر میں ایسے مہمان دیکھنے کے بعد انہیں کھانے کی دعوت پر اصرار کرنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"بیٹی اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ تمہیں دیکھ کر مَیں نے اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس کی ہے" قدسیہ نے کہا۔ "مجھے اپنے مہمانوں کے ساتھ سیر کے لیے جانے کی اجازت ہے؟"

"میں نے کب کہا تھا کہ آپ کو اجازت لینے کی ضرورت ہے۔"

"یوسف بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

"ہاں ہاں ضرور جائیے۔"

"شاید ہمیں دیر بھی ہو جائے۔"

"لیکن مہمانوں کے آرام کا خیال تو رکھو گی نا۔ مجھے کچھ میٹھے خربوزے مل گئے تھے اور مَیں سوچ رہا تھا کہ آج کوئی مہمان آجائے تو بہت اچھا ہو گا۔"

قدسیہ بولی۔ "اب آپ کو یہ پریشانی تو نہیں ہو گی کہ کوٹھی والے آ کر آپ کو تنگ کریں گے۔"

"بھئی پریشانی کس بات کی۔ مَیں انھیں کہہ دوں گا کہ بیگم صاحبہ اپنے مہمانوں کو چھوڑ کر گھر سے نہیں نکل سکتیں لیکن مہمان اتنے اچھے ہیں کہ وہ بھی ان کی دل شکنی پسند نہیں کریں گے۔"

"وہ آ کر یقیناً اِصرار کریں گے کہ ہمارے مہمانوں کو بھی شریک ہونا چاہیے اور آپ مہمانوں کی طرف سے بھی دعوت قبول کر لیجیے۔

عبدالعزیز صاحب سے ڈاکے کے واقعات سن کر مہمانوں کو ہم سے بہت دلچسپی ہو گئی ہے۔"

"اچھا آؤ بیٹی"

فہمیدہ قدسیہ کے ساتھ بیٹھک میں چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ کار میں بیٹھ کر چڑیا گھر کا رُخ کر رہے تھے۔

باب ۔ ۲۲

چڑیا گھر پہنچتے ہی یوسف نے سب سے پہلے باہر کی دو کانوں سے بھنے ہوئے چنے خریدے پھر ٹکٹیں لیں اور اپنی والدہ اور مہمانوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ابھی تک فہمیدہ سے براہِ راست اُس کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے صفیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "خالہ جان! چڑیا گھر کا پروگرام فہمیدہ کے لیے بنایا گیا ہے اِس لیے یہاں سے آگے ہماری رہنمائی وہ کریں گی۔ اور ہمیں اُن کی پسند کی چیزیں دیکھنے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔"

فہمیدہ نے کہا۔ "نہیں جی میں بہت دیر کے بعد یہاں آئی ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کون سے نئے جانور لائے گئے ہیں۔ اِس لیے رہنمائی آپ کو کرنی چاہیے۔"

کوئی بیس منٹ گھومنے کے بعد بلقیس نے کہا۔ "بھئی ہماری عمر کی عورتیں تو اس گرمی میں چڑیا گھر میں پھرتی ہوئی عجیب لگتی ہوں گی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم کہیں چھاؤں میں بیٹھ جائیں اور یوسف صاحب فہمیدہ کو ان کی پسند کے جانور دکھا لائیں۔"

قدسیہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے بہن میں بھی کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں یوسف تم جلدی سے چکر لگا آؤ ہم اُس طرف چھاؤں میں بیٹھ کر تمہارا انتظار

کریں گی لیکن گرمی بہت ہے فہمیدہ بیٹی کو زیادہ تھکا نہ دینا۔"

وہ چل پڑے تو بلقیس نے کہا۔ "آپا جی فہمیدہ اس لحاظ سے بڑی خوش نصیب ہے کہ اِسے جو بھی دیکھتا ہے بڑا پیار کرتا ہے لیکن میں ایک بات بتا دوں اس کے متعلق کہ وُہ اتنی نازک نہیں ہے۔"

چند جانوروں کے جنگلے دیکھنے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کی نگاہوں سے اُوجھل ہو چکے تھے اور یوسف پہلی بار بے تکلفی سے اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"فہمیدہ صاحبہ اب آپ بتائیے کہ ہم کہاں سے شروع کریں دراصل میرا مقصد جانور دیکھنے سے زیادہ آپ سے باتیں کرنا تھا جو بظاہر مجھے ناممکن نظر آتا تھا۔ صرف یہی نہیں مَیں آپ کو اس قدر قریب سے دیکھنا بھی ناممکن سمجھتا تھا۔"

فہمیدہ نے کہا۔ "جی مجھے سب سے پہلے بھیڑیئے کے جنگلے کے پاس لے چلیے۔"

"چلئے، وہیں چلتے ہیں۔ لیکن بھیڑیئے میں آپ کو کوئی خاص دلچسپ بات نظر نہیں آئے گی۔ بس سمجھ لیجیئے کہ وہ ایک طرح کا السیشن کتا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کی درندگی ذرا زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ ایک خصوصیت اس کی یہ ہے کہ وہ جنگلے کے اندر عام طور پر اپنی بھوک کی وجہ سے بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ یہ بھوکا اور بے رحم جانور دیکھ کر کیا کریں گی۔"

فہمیدہ بولی۔ "میں نے یہ جانور دیکھا ضرور ہو گا مگر مجھے یاد نہیں کہ مردار پر آپ کی سرگزشت پڑھنے کے بعد میں اس جانور کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ یوسف صاحب کی داستان میں اگر ان بھیڑیوں کا قصہ نہ آتا تو نانی جان اور نسرین سے اُن کی واقفیت نہ ہوتی۔ اور وہ اُن کے ساتھ سفر کرتے نہ وہ اپنا مسودہ بھیجتے اور نہ میں اسے بار بار پڑھتی۔"

باتیں کرتے کرتے وہ بھیڑیئے کے جنگلے کے قریب پہنچ گئے۔ فہمیدہ کہہ رہی

تھی۔" یوسف صاحب! یہ جانور یقیناً خوفناک ہوگا لیکن میں اس سے نفرت نہیں کرسکتی۔"

یوسف نے پوچھا۔ "فہمیدہ میری تحریر آپ کو واقعی پسند آئی تھی یا آپ میرا دل رکھنے کے لیے باتیں کر رہی ہیں۔"

"یوسف صاحب کاش ان دنوں جب میں رات کی تنہائی میں آپ کی دلچسپ تحریر پڑھا کرتی تھی میرے دبے دبے قہقہے آپ کے کانوں تک پہنچ سکتے۔ آپ کے گاؤں کے مناظر ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہوتے تھے۔ میں گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں گھوما کرتی تھی اور آپ کے ساتھ سرپٹ گھوڑے پر سواری کیا کرتی تھی میں آپ کے "پردیسی درختوں" کے درمیان بھی گھوما کرتی تھی۔ ایک دن نسرین نے مجھ سے کہا تھا "کاش آپا! تم نے بھائی یوسف کو دیکھ لیا ہوتا" اور میں نے اُسے جواب دیا تھا "میری بہن میں انہیں تم سے زیادہ دیکھ چکی ہوں وہ حیران ہو کر پوچھتی تھی، "کہاں"؟ میں نے جواب دیا تھا "اس کتاب کے اندر، اور جب تم بڑی ہو جاؤ گی اور اس کتاب کو سمجھ سکو گی تو تمہیں یہ محسوس ہوگا کہ یوسف جو اس کتاب کے اندر ہے وہ تمہارے اُس بھائی سے زیادہ خوب صورت ہے جس کے ساتھ تم نے سفر کیا تھا۔"

وہ ٹہلتے ہوئے کئی جنگلوں کے قریب گئے لیکن اس ماحول میں انہیں اپنے سوا ہر چیز غیر اہم معلوم ہوتی تھی۔ چنوں کا ایک لفافہ انھوں نے بندروں، ہرنوں، پہاڑی بکروں بارہ سنگھوں اور نیل گایوں کو کھلا دیا تھا۔ جب یوسف نے شتر مرغ کے جنگلے کے قریب جا کر دانوں کی ایک مٹھی بھر کر اس کے سامنے کر دی تو فہمیدہ نے گھبرا کر اُسے پیچھے کھینچتے ہوتے کہا۔ "دیکھئے! کہیں کاٹ لے گا۔ آپ اتنے بڑے قد آور بے تحاشا لمبی گردن اور اس قدر چھوٹے سر والے جانور کا اعتبار کیسے کر سکتے ہیں۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ان تمام باتوں کے باوجود یہ جانور میرے دوست ہیں۔

آپ نیل گایوں اور بارہ سنگھوں کو بھی میرا ہاتھ چاٹتے دیکھیں گی۔ ہاتھی کے ساتھ تو میری اچھی خاصی بے تکلفی ہے۔ سواری کریں گی آپ ہاتھی پر؟"

فہمیدہ مسکرائی اور یوسف کو ایسا محسوس ہوا کہ نسوانی حسن و وقار اطراف عالم سے سمٹ کر اُس کے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔ اگلے جنگلے پر اُس کی دیکھا دیکھی فہمیدہ بھی اپنے ہاتھ سے ہرنوں کو چنے کھلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن جب کوئی ہرن دانوں کی طرف لپکتا تو وہ گھبرا کر ہاتھ باہر نکال لیتی۔ نیل گائیں یوسف کو دیکھتے ہی اس کے پاس جمع ہوگئیں اُس نے لفافے سے چنوں کی مٹھی نکالی اور پورا ہاتھ جنگلے کے اندر کر دیا۔ ایک نیل گائے نے چند دانے منہ میں ڈالے تو یوسف نے مٹھی بند کر کے دوسری نیل گائے کے آگے کر دیے اور پھر اس نے خالی ہاتھ کھول دیا اور دونوں اُسے چاٹنے لگیں۔

فہمیدہ نے پوچھا "آپ کو بالکل خوف نہیں آتا کسی جانور سے؟"

"ان جانوروں سے تو آپ کو بھی خوف نہیں آنا چاہیے۔ آپ کے ہاتھ اللہ نے ایسے بنائے ہیں کہ ان جانوروں میں سے کسی کا دماغ اگر بالکل جواب دے جاتے تو بھی وہ ان ہاتھوں کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

فہمیدہ نے مسکراتے ہوئے گردن جھکالی اور اپنے ہاتھ چادر کے اندر کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں جناب! میں ان کی دماغی حالتوں کا معائنہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔ لیکن چلیے! وہ ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی! آپ کو دیکھنے سے قبل میرے دل میں ہزاروں سوال تھے۔ لاتعداد شکایات تھیں اور دل میں دعا کر رہی تھی کہ آپ سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ اب باتیں کرنے کا موقع ملا ہے تو صرف ایک شکایت ذہن میں رہ گئی ہے کہ آپ لاپتہ کیوں ہو گئے تھے؛ ہمارا پتہ اپنے سامان کے ساتھ بھول جانا کوئی معقول بہانہ نہیں ہوگا کیونکہ اگر آپ کو یہ احساس ہوتا کہ میری ننھی بہن اتنی پریشان ہوگی تو آپ فوراً ہمارا پتہ معلوم کر سکتے تھے۔ آپ کوئٹہ میں ہمارے

رشتہ داروں سے رابطہ پیدا کر سکتے تھے۔ آپ کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میرے چھوٹے چچا میڈیکل کالج سے فارغ ہو کر انگلستان گئے ہیں۔ آپ میڈیکل کالج جا کر ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں وہاں آپ کو کئی ایسے استاد اور طالب مل جاتے جو ہمارے متعلق بتا سکتے تھے۔"

یوسف مسکرایا: "اللہ کے بعض انعامات ان راستوں سے آتے ہیں جن کے متعلق ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ دیکھیے میں گاڑی میں اپنا ایک تھیلا بھول گیا تھا اور قدرت نے نسرین کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ اِس تھیلے سے میرا مسودہ اُس ذہین لڑکی کے پاس پہنچا دے جو اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں نسرین کو بھولا نہیں تھا، لیکن اسے دوبارہ دیکھنے کا معاملہ میں نے اللہ کو سونپ دیا تھا۔ مجھے یہ بھی اطمینان تھا کہ اپنے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر مجھے نسرین کی نانی اور باقی عزیزوں کو تلاش کرنے میں مشکل پیش نہیں آئے گی۔ لیکن میرے طالب علمی کے دور سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب دیکھیے تھوڑی سی پریشانی کے بعد مجھے کتنے انعام ملے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذہن میں ڈالا اور آپ نے خط لکھ دیا اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مستقبل کے ایک ایسے ناول نگار سے دلچسپی رکھتے ہیں جس کی چاروں اطراف سے حوصلہ شکنی ہوئی۔"

فہمیدہ نے کہا۔ "یوسف صاحب میں صرف دلچسپی ہی نہیں رکھتی بلکہ مجھے یقین ہے کہ ادب کے جس میدان میں آپ قدم رکھنا چاہتے ہیں وہاں آپ کا کوئی حریف نہیں ہوگا۔"

"فہمیدہ تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری چھوٹی سی بہن تمہارے متعلق اتنا کچھ جانتی تھی اور تم پر اتنا فخر کرتی تھی کہ میں سراسر ایک اجنبی ہونے کے باوجود اس کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا لیکن میری حالت یہ ہے کہ اب تک اِس دنیا میں صرف

تین انسان مجھے جانتے ہیں ایک میری امی جان جن کی بدولت چاروں اطراف سے حوصلہ شکنی کے باوجود میری خود اعتمادی قائم رہی ہے اور دوسری آپ اور آپ کی چھوٹی بہن نسرین جن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔"

یوسف صاحب! "امی جان بھی آپ کا مسودہ پڑھ چکی ہیں اس لیے انھیں بھی اپنے مداحوں میں شامل کر سکتے ہیں آپ کے گاؤں کا ماحول اور اس کے قدرتی مناظر میرے دل پر نقش ہو چکے ہیں۔ مَیں آپ کے "پردیسی درختوں" کے متعلق اکثر سوچا کرتی ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دن وہاں جا کر انھیں دیکھ سکوں؟"

"فہمیدہ آج مجھے کوئی بات ناممکن محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے تو یہ بھی بعید از امکان محسوس نہیں ہوتا کہ واپسی پر آپ ہمارے گاؤں کے ریلوے اسٹیشن پر اتر پڑیں اور پھر چند دن ہمارے ہاں مہمان رہیں۔ امی جان آپ کی آمد کی اطلاع ملنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں گی۔ پچھلے دنوں مَیں نے ابا جان سے کہا تھا کہ لاہور کی آب و ہوا کا امی جان پر اچھا اثر نہیں پڑ رہا اور یہ فیصلہ ہوا تھا کہ سال میں دو تین بار وہ چند ہفتے گاؤں چلی جایا کریں گی۔"

فہمیدہ نے کہا۔ "مجھے بہت سی باتیں گاڑی پر سوار ہونے کے بعد یاد آئیں گی اور آپ بھی شاید ہمیں رخصت کرنے کے بعد یہ محسوس کریں کہ کچھ ضروری باتیں رہ گئی ہیں لیکن ایک بات جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہی یہ ہے کہ آج سے ہمیں ایک دوسرے کے لیے دعاؤں کی ضرورت ہے اور جس طرح میں اچانک اپنے راستے سے بھٹک کر آپ کے پاس آگئی ہوں اسی طرح اگر کسی دن آپ ہمارے پاس پہنچ جائیں تو ہمارے گھر میں آپ کو دیکھ کر اس قدر خوشی ہوگی جس طرح مجھے دیکھ کر آپ کی امی کو ہوئی تھی۔"

بلقیس نے اُن کی طرف دیکھتے ہی قدسیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "دیکھو بہن! وُہ کتنے اطمینان سے آ رہے ہیں۔ آپ کو بلا وجہ فہمیدہ کے کھو جانے کا خوف تھا۔ اب اُٹھئے یہاں سے نکلیں۔ نماز ہم لارنس گارڈن میں پڑھیں گے۔"

○

تھوڑی دیر کے بعد وہ چڑیا گھر سے نکل رہے تھے کہ انھیں گیٹ سے باہر امینہ کے ساتھ ایک عورت دکھائی دی۔

یوسف نے کہا۔ "امی جان امینہ یہاں بھی پہنچ گئی۔"

قدسیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بیٹا! وہ ہمارے گھر گئے ہوں گے اور تمہارے ابا جان نے کہہ دیا ہو گا کہ ہم چڑیا گھر کی طرف گئے ہیں اِس لیے وہ اس طرف آ گئے ہیں۔ آخر امینہ ہمارے مہمانوں کو کار دکھائے بغیر کیسے رہ سکتی ہے؟"

بلقیس نے کہا۔ "جی وہ دعوت پر زور دینے کے لیے آئی ہوں گی، مجھے اُن سے بات کرنے دیجئے اور وہ جو ساتھ ہے وہ اُس کی کون ہے؟"

یوسف نے جواب دیا وہ امینہ کے سوتیلے ماموں قائم دین کی لڑکی ہے جو امرتسر میں عبدالکریم صاحب کے اینٹوں کے تین بھٹوں کی نگرانی کرتا تھا اور کوئی تین سال سے ہمارے گاؤں کے پاس عبدالکریم کی زمین کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ اس نے چند ایکڑ زمین اپنے لیے بھی خرید لی ہے۔

قدسیہ بولی۔ بھئی اس کا نام قائم دین ہے؟

یوسف نے ہنس کر کہا۔ "جی نہیں اس کا نام چراغ بی بی ہے، قائم دین اُس کا باپ ہے۔"

قدسیہ بولی۔ "ارے میں چراغ بی بی کو پہچان ہی نہیں سکی گاؤں میں تو یہ کئی بار ہمارے گھر آ چکی ہے۔ پھر اس کی شادی ہو گئی تو میں نے نہیں دیکھا۔ ایک خبر سُنی

تھی کہ لڑکا منگنی کے دو ماہ بعد فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد مدت سے لاپتہ ہے؟"

امینہ اور دوسری عورت جھجکتی ہوئی آگے بڑھیں۔ قدسیہ نے رسمی علیک سلیک کے بعد کہا "بھئی اب نماز کا وقت ہو چکا ہے۔ ہم پہلے لارنس گارڈن کے کسی گوشے میں نماز پڑھ لیتی ہیں اس کے بعد کسی جگہ آرام سے باتیں کریں گی۔ بیٹی! آپ ہمارے گھر سے ہو کر آئی ہیں؟"

"جی ہاں! جب ہمارے نوکر نے گھر جا کر یہ بتایا کہ آپ کے مہمان اُس انسپکٹر صاحب کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے ڈاکوؤں کے خلاف ہماری مدد کی تھی تو ابا جی نے اُسی وقت ڈرائیور کو حکم دیا تم ابھی میاں صاحب کے گھر جا کر پتہ کرو کہ انسپکٹر صاحب کس جگہ رہتے ہیں پھر میں خود جا کر اُن کے تمام عزیزوں کو دعوت دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "مَیں ڈرائیور کے ساتھ جاتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جب میں امی جان اور آپ کی طرف سے دعوت دوں گی تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ وُہ یوں بھی بہت تھکے ہوئے تھے اور امی جان بہت مصروف تھیں۔ اِس لیے انھوں نے چراغ بی بی کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ یہ اب چند ماہ سے یہاں رہتی ہے اسے آپ کے مہمانوں سے ملنے کا بہت شوق تھا۔"

چراغ بی بی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھ رہی تھی اور فہمیدہ کو اُس کی نگاہوں سے اتنی الجھن محسوس ہوتی تھی کہ وہ کبھی کسی طرف دیکھنے لگ جاتی اور کبھی اپنی چادر کھینچ کر ذرا اور نیچے کر لیتی۔ فہمیدہ اس کی ماں، چچی اور قدسیہ نے ایک جگہ گھاس پر نماز ادا کی۔ یوسف ان سے کچھ دُور نماز پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ امینہ اور چراغ بی بی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگیں اور

پھر ان کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے دونوں موٹروں کے ڈرائیور نیچے اتر کر ایک جگہ نماز میں مصروف ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر عورتوں نے ٹہلنا شروع کر دیا۔ امینہ سخت پریشانی کی حالت میں ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بلقیس نے ایک لمبا چکر لگانے کے بعد ان کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

"بھئی تم سیر نہیں کرو گی۔؟"

"جی اس وقت؟"

"بیٹی ابھی تو ہوا کچھ خوشگوار ہوئی ہے! اس عمر میں آپ لوگوں کو سورج نکلنے سے پہلے یہاں پہنچنا چاہیے اور دوڑ کر پہاڑی کی چوٹی پر جا کر لمبے لمبے سانس لینے چاہئیں۔ کہتے ہیں کہ آکسیجن سے تازہ خون پیدا ہوتا ہے اور بیمار چہرے سُرخ نظر آنے لگتے ہیں۔"

قدسیہ نے کہا۔ "بہن آپ نے دن کی روشنی میں نہیں دیکھا۔ امینہ کا چہرہ ماشاءاللہ بہت سرخ ہے۔"

"اری بہن۔ دو منٹ دھوپ میں کھڑی رہنے کے بعد سب کے چہرے سُرخ ہو جاتے ہیں۔"

"نہیں بہن میرا مطلب یہ ہے کہ امینہ کافی صحت مند لڑکی ہے۔"

چراغ بی بی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ بہر حال وُہ بولی "آپا جی! امینہ کا رنگ بھی ٹھیک ہے اور اس کی صحت بھی بہت اچھی ہے۔ اللہ نے ہر نعمت دی ہے۔ پانی مانگے تو پھلوں کا رس اور دُودھ ملتا ہے۔"

"دیکھو بہن" صفیہ نے کہا۔ "دودھ اور پھلوں کی طرح خالی پانی بھی ایک نعمت ہے اگر کوئی پانی چھوڑ دے تو بھی وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ امینہ ایک سمجھ دار بچی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ پانی کی جگہ کوئی قیمتی چیز تلاش نہیں کرے گی۔"

"دیکھو چراغ بی بی تم میری وکالت نہ کیا کرو۔" امینہ نے غصّے سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خاص کر ان لوگوں کے سامنے جو تمہیں پڑھے لکھے نظر آئیں۔ جنہیں دیکھنے سے تمہیں احساس ہو جائے کہ یہ ہر بات تم سے زیادہ جانتے ہیں۔"

چراغ بی بی اگرچہ عمر میں امینہ سے چار سال بڑی تھی تاہم وُہ یہ سمجھ کر خاموش رہی کہ عبدالکریم کے سامنے اُس کی حیثیت ایک رشتے دار کی بجائے ایک ملازم کی سی ہے۔

بلقیس نے کہا۔ "بیٹی جہاں تک تمہاری دعوت کا تعلق ہے اُس کے متعلق تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ ہم سب آئیں گے۔"

"شکریہ چچی جان کل تین موٹریں یوسف صاحب کے مکان پر پہنچ جائیں گی۔ ایک آپ انسپکٹر صاحب کے مکان پر پہنچا دیں باقی دو موٹروں پر آپ سب آ جائیں۔"

بلقیس نے کہا "بیٹی ہمارا پروگرام تو یہ تھا کہ ہم علی الصبح اٹھیں اور آپ کی دعوت پر جانے سے پہلے آپ کی نئی کار پر شاہی مسجد، قلعہ اور جہانگیر کا مقبرہ دیکھ آئیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ تھک جائیں گی۔"

"نہیں جی! مجھے قطعاً تھکاوٹ محسوس نہیں ہو گی۔ بلکہ اس بات کی خوشی ہو گی کہ میں فہمیدہ بہن سے کچھ دیر باتیں کر سکوں گی۔"

"لیکن بھئی۔ آپ نماز کے وقت اُٹھیں گی تو سورج نکلنے سے پہلے ہمارے گھر پہنچ سکیں گی۔"

"خالہ جان!" اُس نے جواب دیا۔ "انشاء اللہ میں سورج نکلنے سے پہلے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ اَب مجھے اجازت دیجئے۔ چلو آپا چراغ بی بی۔"

وہ السلام علیکم کہہ کر تیزی سے کار کی طرف مڑی۔

اُن کے روانہ ہوتے ہی یوسف نے کہا۔ "چچی جان یہ دکھاوے کی عادت گھر

کے ماحول کا نتیجہ ہے ورنہ امینہ طبعاً ایک اچھی لڑکی ہے“

”چلئے پہاڑی پر جا کر چاند نکلتا دیکھتے ہیں۔ اب ہوا بہت خوشگوار ہو گئی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ یوسف اور فہمیدہ کی رفتار ذرا تیز تھی اور وہ کچھ دُور آگے نکل گئے تھے۔

بلقیس نے ایک جگہ رُکتے ہوئے کہا۔ ”بھئی میں تھک گئی ہوں۔ تھوڑی دیر سانس لے لو۔“

وہ ایک جگہ لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گئیں۔ یوسف فہمیدہ کے ساتھ چوٹی پر پہنچا اور کچھ دیر چھوٹے سے میدان میں ٹہلنے کے بعد فہمیدہ کو ایک بنچ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”فہمیدہ تھوڑی دیر خاموشی سے اِسی سمت دیکھتی رہو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہارا چہرہ چاند سے زیادہ تابناک ہے۔“

فہمیدہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال یہ تھا کہ آپ عام شاعروں جیسی بات نہیں کریں گے۔“

”فہمیدہ میں انتہائی ندامت کے ساتھ اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آئندہ میں آپ کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ آپ کیسی ہیں۔ دیکھو ایک بچہ چاند کی طرف دیکھ کر خوش بھی ہوتا ہے اور اُچھل اُچھل کر اُسے پکڑنے کی کوشش بھی کرتا ہے پھر کوئی چوٹ لگ جانے کی وجہ سے وہ روتا بھی ہے لیکن تم مجھے ایسے بچے کے کھیل کھیلتے نہیں دیکھو گی۔ آج تمہاری پہلی جھلک دیکھنے کے بعد میں زندگی کے سفر کی وہ منازل اور راستے دیکھ رہا تھا جو میرے تصور میں نہیں تھے۔ کیا تم نے بھی پہلی ملاقات میں میری امی جان کے طرزِ عمل سے یہ محسوس نہیں کیا کہ تم ان کی زندگی کے حسین ترین خوابوں کی تعبیر ہو۔ اگر کبھی فرصت ملی تو تمہیں یہ سمجھا سکوں گا کہ وہ اس قدر جذبات میں کیوں آگئیں

تھیں۔ لیکن اپنے دل میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ میں اُن کی ہر خواہش پوری کروں گا۔ اگر انہوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہر وہ لڑکی جو میری زندگی کے کٹھن راستوں میں میرا ساتھ دے سکتی ہے اور میں اسے زندگی کی خوشیاں دے سکتا ہوں تو میں رُوئے زمین کی تمام نعمتیں اِس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس وقت بھی تمہاری امی کے کان میں ہر بات کہہ سکتا ہوں کہ مَیں ایک سیدھا سادھا دیہاتی لڑکا ہوں جس نے کوئی قابلِ فخر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی۔ لیکن اگر میں نصف دنیا کا مالک ہوتا تو اسی وقت اپنے اور تمہارے تمام عزیزوں کو یہاں جمع کرتا اور تمہارے والدین کے سامنے دو زانو ہو کر یہ اعلان کرتا کہ میں فہمیدہ کے لیے سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ چلئے وہ سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

فہمیدہ خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑی۔ چند قدم چل کر وہ رُک گئی:

”ٹھہریئے! مَیں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”پوچھیئے۔“ یوسف نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

فہمیدہ بولی۔ ”کبھی آپ ان باتوں پر ہنسا تو نہیں کریں گے؟“

”کون سی باتوں پر۔“

”یہی جو آج آپ ابھی کہہ رہے تھے۔“

یوسف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عورتوں مردوں اور بچوں کی ایک ٹولی باتیں کرتی ہوئی نمودار ہوئی تو وہ خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد فہمیدہ نے کہا۔

”چلئے ہم اس طرف سے چکر لگا کر چلتے ہیں۔“

وہ ایک دوسرے راستے سے نیچے اُترنے لگے تھوڑی دیر بعد یوسف کہنے لگا:

”فہمیدہ بظاہر یہ بات ایک مذاق معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ میں نے تمہیں آج ہی پہلی بار دیکھا اور چند گھنٹے بعد آج ہی میں نے وہ بات کہہ دی ہے جس کے لیے

مدتوں سوچا جاتا ہے لیکن میں نے تمہاری پہلی جھلک دیکھنے اور پہلی بار تمہاری آواز سننے کے بعد یہ محسوس کیا تھا کہ میں برسوں سے تمہیں جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی میری باتیں سُن کر یہ محسوس نہیں کیا ہوگا کہ ایک اجنبی تمہارے سامنے گستاخی کر رہا ہے۔"

"آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔"

"شکریہ اب چلیئے۔"

چند منٹ کے بعد وہ اُس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں صفیہ، بلقیس اور قدسیہ بیٹھی ہوئی تھیں وہ اُنھیں دیکھتے ہی اُٹھ کر ساتھ چل پڑیں اور تھوڑی دیر بعد وہ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے۔ جب وہ گھر پہنچے تو عبدالعزیز اور مسز احمد وہاں موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ مسز احمد نے مغرب کی نماز کے بعد اچانک گھر میں آرام کرنے کا ارادہ بدل دیا تھا اور وہ عبدالعزیز کے ساتھ تانگے پر یوسف کے گھر کو روانہ ہو گئی تھیں جو کوئی آدھ گھنٹے پہلے یہاں پہنچے تھے۔ میاں عبدالرحیم نے جس گرم جوشی سے عبدالعزیز کا خیر مقدم کیا اور پھر جس طرح انھیں باتوں میں مصروف رکھا اُس سے انھیں یہ نصف گھنٹہ محسوس نہ ہوا۔ لیکن مسز احمد جنھیں بچوں کے ساتھ یہ وقت گذارنا پڑا سخت پریشان تھیں۔

"کیسے بے وقوف ہیں یہ لوگ یہ سیر کا کون سا وقت ہے۔" وُہ بار بار کہہ رہی تھی لیکن جب یوسف نے آکر ماں جی السلام علیکم کیا تو ان کے سارے گلے جاتے رہے اور اُس نے کہا۔ "بیٹا میں نے سخت غلطی کی جو تمہارے ساتھ نہیں آئی تھی۔ عبدالعزیز کام کیلئے چلے گئے تھے اور شام تک غائب رہے فضلاں بی بی اور باقی سب یہاں آگئے تھے اور نوکر ایسا تھا کہ اُس کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اور اُن کے والد میاں عبدالعزیز کے ساتھ خواتین اد.

بچے علیحدہ علیحدہ کمروں میں کھانا کھا رہے تھے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد عبدالعزیز اگلی دوپہر عبدالکریم کی دعوت میں شرکت کا وعدہ کرنے کے بعد بلقیس کے ساتھ واپس چلا گیا اور صفیہ، فہمیدہ اور اس کی نانی وہیں ٹھہر گئیں۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ بالا خانے کی چھت پر لیٹ گئیں اور مسز احمد نے چند منٹ قدسیہ کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد کہا۔ "بیٹی یوسف کہاں غائب ہو گیا ہے؟"

"جی وہ مسجد سے نماز پڑھ کر آ ہی رہے ہوں گے۔"

"اچھا تو بیٹی! نوکر سے کہو یہاں اُس کے لیے کُرسی رکھ دے اور اُسے آتے ہی میرے پاس لے آئے۔ مَیں اُس سے بہت کچھ سننا چاہتی ہوں۔"

فہمیدہ بولی! "نانی جان۔ میں بھی آپ کی باتیں سُن سکتی ہوں۔"

قدسیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹی ہم سب ان کی باتیں سُنیں گے۔ مَیں سب کے لیے کرسیاں بھیجتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اوپر آیا اور مسز احمد کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ماں جی آپ کا سر دبا دوں۔"

"نہیں بیٹا۔ یہ تمہیں کس نے بتایا کہ میرے سر میں درد ہوتا ہے۔"

"ماں جی۔ سر درد کے لیے تو نہیں دبایا جاتا۔ میں نے ایک دن نسرین کو آپ کا سر دباتے دیکھا تھا۔"

"ارے بیٹا! تم نسرین نہیں ہو، یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے ڈاکوؤں کا سارا قصہ سناؤ۔"

صفیہ نے کہا۔ "ماں جی ہم نے وہ لڑکی بھی دیکھی ہے جس کا گھر لوٹنے وہ ڈاکو آئے تھے۔"

"کہاں دیکھا تم نے اُس کو۔"

"وہیں چڑیا گھر میں۔ امی جان۔"

"ارے! چڑیا گھر میں وہ کیا کرتی تھی۔"

"امی جان! وہ یہاں کل کے لیے دعوت دینے آئی تھی۔ جب یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم چڑیا گھر کی طرف گئے ہیں تو اپنی کار بھگا کر وہاں پہنچ گئی اور یہ وعدہ لے کر گئی تھی کہ ہم سب ان کی دعوت میں شریک ہوں گی اور صبح وہ ہمیں اپنی کار پر لاہور کی سیر کرانے کے لیے بھی آئے گی۔"

مسز احمد نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ مجھے کل اُس کی دعوت میں شریک ہونا پڑے گا۔ اور صبح سیر کے لیے بھی اُس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ کیوں بیٹا یوسف! وہ کار اچھی طرح چلانا جانتی ہے۔"

"ماں جی! خطرے کی کوئی بات نہیں۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ اگر چچا عبدالعزیز صاحب کے عزیزوں میں سے کسی کو خراش بھی آگئی تو تمہاری کم از کم سزا یہ ہوگی کہ ڈرائیونگ لائسنس سے محروم ہو جاؤ گی۔"

"اچھا بیٹا۔ اب شروع کرو وہ ڈاکوؤں کا قصہ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ واقعہ کب ہوا تھا؟"

"ماں جی۔ گھر پہنچنے سے چند دن بعد۔ میں اس قسم کے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔ عبدالعزیز صاحب اس سے کچھ عرصہ پہلے کہیں سے تبدیل ہو کر ہمارے ضلع میں آچکے تھے، لیکن مجھے قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نسرین کے چچا ہیں یا آپ سے ان کا کوئی رشتہ ہے۔"

"اچھا بیٹا۔ اب وہ قصہ شروع کرو۔"

یوسف نے پوری تفصیل کے ساتھ ڈاکوؤں کے متعلق قبل از وقت اطلاع ملنے

اور ان کی گرفتاری کے واقعات بیان کرنا شروع کر دیئے جب وہ سیٹھ دینا ناتھ کا ذکر کر رہا تھا تو وہ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔

مسز احمد کہہ رہی تھی۔ "بیٹا میں بلاوجہ تمہاری زبان سے یہ باتیں سننے کے لیے بے چین نہ تھی اور کوئی اس قدر اطمینان سے باتیں کرتا بھی تو نہیں۔ لیکن ایک بات پر مجھے بار بار افسوس آتا ہے۔"

"ماں جی! وہ بات کیا ہے؟"

"بیٹا وہ بات یہ ہے کہ اس وقت نسرین یہاں نہیں ہے ورنہ وہ خوشی سے دیوانی ہو جاتی۔"

صفیہ نے کہا۔ "اپنی زندگی کے ایسے تمام دلچسپ واقعات آپ کو لکھ چھوڑنے چاہئیں جو مسودہ آپ وہاں چھوڑ آئے تھے اُسے پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ جو باتیں لکھیں گے انھیں ہر عمر کے لوگ پسند کریں گے۔"

"خالہ جان آپ میرے لیے دعا کیا کریں کہ میں اپنے تمام فرائض پورے کرسکوں بس اپنے دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی اَن گنت آوازیں لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکوں۔"

"ماں جی آپ بھی میرے لیے دعا کریں کہ میں اپنے بزرگوں کی بلند توقعات پوری کرسکوں اور ماں جی وہ کون سی دعا ہے جو آپ نے میرے لیے نہیں کی ہوگی۔ اُن بے شمار دعاؤں میں سے جو آپ صبح و شام دہرایا کرتی ہیں اس چھوٹی سی ایک اور دعا کا اضافہ کر لیجیے کہ میں ان پاکباز لوگوں کو ٹھیس نہ پہنچاؤں جو میرے خلوص پر اعتماد کرتے ہیں اور میری اُن باتوں پر بھی یقین کر لیتے ہیں جو آج دوسروں کو مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔"

وہ اُٹھا اور فہمیدہ نے جو اُس کی ماں کے ساتھ دائیں ہاتھ سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی ایسا محسوس کیا کہ اس کے قد و قامت میں اچانک اضافہ ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر

بعد وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی دل میں کہہ رہی تھی۔

"یوسف تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تمہیں دیکھنے سے پہلے بھی یقین تھا کہ تم کسی کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتے۔"

○

قدسیہ اپنے مہمانوں کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی کہ باہر موٹر کار کا ہارن سنائی دیا۔ اُس نے اپنی کمسن بیٹی سے کہا۔ بیٹی جا کر دیکھو اگر امینہ ہے تو اسے یہیں لے آؤ۔ صغریٰ اُٹھ کر سلیپر پہن رہی تھی کہ یوسف کی آواز سنائی دی۔

"آپ سیدھی اندر چلی جائیں۔"

اس کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی اور چند ثانیے بعد امینہ اُن کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے بنفشئی رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔

"دیکھیے میں اپنے وعدے کے مطابق پہنچ گئی ہوں اور آپ نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔"

صفیہ مسز احمد سے مخاطب ہو کر بولی۔ "امی جان یہ امینہ ہے۔"

امینہ نے السلام علیکم کہہ کر فہمیدہ پر جو اپنی نانی کے ساتھ بیٹھی تھی نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ عام گھریلو لباس میں بھی ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ قدسیہ نے کہا۔

"بیٹی بیٹھ جاؤ اور کچھ کھا لو ہم ابھی تیار ہو جائیں گی۔"

"شکریہ خالہ۔ میں پورا ناشتہ کر کے آئی ہوں۔"

"اچھا تو تم بیٹھ کر بہن صفیہ کی امی سے باتیں کرو۔ انھیں تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ فہمیدہ بیٹی تم اُٹھ کر جلدی سے کپڑے بدل لو۔"

فہمیدہ بولی: "خالہ جان میرے کپڑے ٹھیک ہیں کھانے پر جاتے وقت میں دوسرا جوڑا پہن لوں گی۔"

"اچھا پھر آپ سب امینہ کے ساتھ موٹر میں بیٹھ جائیں میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔ لیکن بیٹی امینہ میری ایک بات اچھی طرح سُن لو تم نے موٹر بہت احتیاط سے چلانی ہے۔"

قدسیہ یہ کہہ کر بیٹھک میں چلی گئی جہاں میاں عبدالرحیم اور یوسف ناشتے سے فارغ ہو کر باتیں کر رہے تھے اُس نے کہا۔ "یوسف! تم نے مہمانوں کے ساتھ جانا ہے۔"

"امی جان!" یوسف نے احتجاج کیا۔ "امینہ اپنے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لائی اس لیے میں اس کے ساتھ نہیں بیٹھوں گا۔"

"بیٹا وہ ڈرائیور کو اس لیے ساتھ نہیں لائی کہ ہم میں سے زیادہ لوگوں کو ساتھ لے جا سکے۔ اب میں اس بات کا ذمہ لیتی ہوں کہ تمہیں اُس کے ساتھ نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ اُٹھو تیاری کرو۔ صغریٰ ہمارے ساتھ جائے گی۔"

یوسف اُٹھ کر چلا گیا تو قدسیہ نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ایسے مہمان بار بار نہیں آتے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ عام مہمان نہیں ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی کام ہے تو آپ کو کسی تمہید کی ضرورت نہیں۔"

قدسیہ نے کہا۔ "ایسے موقعوں کے لیے میں نے کپڑوں کے چند جوڑے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک آج مسز احمد اور دوسرا صفیہ کو پیش کیا جائے گا لیکن گھر میں کوئی تحفہ ایسا نہیں جو فہمیدہ کو پیش کیا جا سکے۔ فہمیدہ کی ایک چھوٹی سی بہن ہے جسے میں کچھ بھیجنا چاہتی ہوں۔ اِس لیے آپ انار کلی کے کسی بہترین دکاندار کے پاس جائیں اور اُس کے پاس جو سب سے اچھا کپڑا ہو اُس کے دو سوٹ خرید لائیں۔ مجھے یقین ہے کہ فہمیدہ کو دیکھنے کے بعد آپ اُس کے لباس کے انتخاب میں غلطی

نہیں کریں گے اور کہتے ہیں کہ اُس کی چھوٹی بہن بھی قریباً اسی جیسی ہے۔ عمر تین چار سال کم ہو گی۔ تحائف انہیں روانہ ہوتے وقت دیے جائیں گے۔ یوسف نے آپ کو بتایا ہے کہ ہمارے تعلقات کس طرح شروع ہوتے تھے۔"

"ہاں بھئی۔ ابھی ہم یہی باتیں کر رہے تھے۔"

قدسیہ کمرے سے نکلی تو خواتین موٹر کے گرد کھڑی تھیں اور یوسف گلی کے موڑ کے قریب اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ امینہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھی بے چینی سے باہر جھانک رہی تھی۔

قدسیہ بولی: "بیٹا تم نے ابھی تک بٹھایا نہیں اُن کو؟"

"امی جان! آپ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اُن کے ساتھ نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ اب آپ یہ بتائیں کہ بیٹھنے کی ترتیب کیا ہو گی۔"

"بیٹا تم پچھلی سیٹ پر مسز احمد اور صفیہ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرو گے۔ صغریٰ بھی آپ لوگوں کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ جائے گی، اگلی سیٹ پر امینہ کے ساتھ میں اور فہمیدہ بیٹھ جائیں گی۔"

یوسف نے بدحواس ہو کر کہا "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ اپنی سائیکل اُٹھا لوں اور ایک تانگہ روک کر آپ کو فہمیدہ کے ساتھ بٹھا دوں لیکن یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گا کہ آپ اور فہمیدہ کی جانوں کی حفاظت دو منٹ کے لیے بھی امینہ کے سپرد کر دی جائے۔"

فہمیدہ مسکرائی "میں نانی جان سے کہہ دوں گی کہ امینہ پر کنٹرول رکھنے کے لیے یوسف صاحب کا آگے ہونا ضروری ہے۔ اِس لیے آپ اور میری امی آگے بیٹھیں گے اور پیچھے نانی جان، آپ کی امی اور صغریٰ کو جگہ مل جائے گی، لیکن آپ جلدی سے بیٹھ جائیے۔ وہ اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے اس کے متعلق کوئی

سازش کر رہے ہوں۔"

"اُسے تیز رفتاری سے روکنے کا گُر مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ اسے راستے میں ایک دوبارہ یہ یاد دلانا پڑے گا کہ عبدالعزیز صاحب آپ کے چچا ہیں اور اُس کی ڈرائیونگ کی کسی غلطی سے اگر ان کی لاڈلی بھتیجی کو ہلکی سی خراش آ گئی تو یہ خوب صورت موٹر دوبارہ سڑک پر نہیں آ سکے گی۔"

"چلیے۔"

یوسف نے صفیہ کو ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ بٹھا دیا اور اس کے ساتھ خود بیٹھ گیا اور باقی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ جب کار اسٹارٹ ہوئی تو مسز احمد نے کہا۔

"ارے بھئی! یہ سب تم سے خوفزدہ تھے۔ ذرا احتیاط سے چلانا۔"

"جی آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"بیٹی۔ مجھے سچ سچ بتا دو۔ آج تک تم نے کتنے ایکسیڈنٹ کیے ہیں۔"

امینہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے بے خیالی میں کار کی رفتار تیز کر دی۔

مسز احمد چلائیں۔ "ارے بیٹا روکو اسے۔"

امینہ نے کار کی رفتار کم کر دی اور یوسف نے اُس کی دل جوئی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا "ماں جی! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ امینہ نے آج تک کوئی ایکسیڈنٹ نہیں کیا ان کا پاؤں ایسے وقت میں ایکسیلیٹر پر آ گیا تھا جب ان کا خیال کہیں اور تھا۔"

صفیہ نے کہا "ہاں ماں جی۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ اب دیکھیے نا کس صفائی سے چلا رہی ہیں یہ موٹر۔"

"ہاں بیٹی۔ یہ ٹھیک چلاتی ہے لیکن ہمیں یہ دعا ضرور مانگتے رہنا چاہیے کہ جب

تک ہم بخیریت واپس نہیں آجاتے ان کے خیال کسی اور طرف نہ نکل جائیں۔"

انہوں نے دریا دیکھا۔ جہانگیر کا مقبرہ دیکھا۔ واپسی پر بادشاہی مسجد دیکھی لیکن جب قلعہ دیکھنے کا مسئلہ آیا تو فہمیدہ نے کہا "اب نانی جان کو گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ قلعہ ہم کبھی آئندہ لاہور آکر دیکھیں گے۔ بھئی امینہ موٹر چلانے میں واقعی بہت ماہر ہیں۔"

صفیہ نے کہا "یوسف صاحب کے منہ سے تعریف سننے کے بعد شاید کسی اور سے شاباش لینے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔"

امینہ نے کہا "اگر آج بادل ہوتے تو میں آپ کو بہت سیر کرواتی۔"

"تم فکر نہ کرو بیٹی۔ لاہور میں ہم بھی آتے رہیں گے بادل بھی آتے رہیں گے اور خُدا تمہارے باپ کے کاروبار میں برکت دے وہ کاروں کے نئے نئے ماڈل خریدتے رہیں گے۔ میں تو یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ میں جب کبھی بہت ہی اچھے موسم میں یہاں آؤں گی تو تمہاری کار پر یہاں سے جالندھر، لدھیانہ، دہلی اور آگرہ تک سفر کروں۔"

"جی میں آپ کو راولپنڈی اور پشاور کی سیر بھی کروا لاؤں گی۔"

واپسی پر کار قدسیہ کے گھر رُکی، مہمانوں کی لیمن کی ٹھنڈی بوتلوں سے تواضع کی گئی۔ جب وہ دوبارہ روانہ ہونے لگے تو فہمیدہ سفید لباس پہن کر ایک کمرے سے نکلی اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ یوسف نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ قدسیہ بار بار اپنے دل میں یہ الفاظ دہرا رہی تھی "یا اللہ اس بچی کو نظر سے بچائیں۔ اس کی معصومیت اِسی طرح قائم رکھیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ کار پر سوار ہو کر امینہ کی کوٹھی کا رُخ کر رہے تھے۔

صفیہ یوسف سے باتوں میں مصروف ہو گئی تو اچانک امینہ نے کہا "خالہ میری امی کی بڑی خواہش ہے کہ آپ دو چار دن ہمارے ہاں مہمان رہیں۔"

صفیہ نے مڑ کر مسز احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی جان سُنا آپ نے امینہ آپ کو تین چار دن اپنی کوٹھی میں مہمان رکھنا چاہتی ہے۔ چونکہ اس کے ابا جان کی بھائی جان سے پرانی واقفیت ہے اِس لیے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

مسز احمد بولی "اری بیٹی یہ دعوت کسی اچھے وقت پر ملتوی کر دو اور اس بیٹی کو بتا دو کہ تم کانگڑہ جا رہی ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔ رات میں نے لدھیانہ واپس جانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"سچ نانی جان" فہمیدہ نے خوشی سے اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔

"اری اتنی انجان نہ بنو تمہیں معلوم تھا کہ مَیں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی اور نسرین کو تو یقین تھا کہ جب گھر جانے کا موقع آئے گا تو میں اچانک تمہارے ساتھ کانگڑہ کی طرف چل پڑوں گی اور اب وہ چڑیل قہقہہ مار کر یہ کہے گی کہ میں نے ارادہ تبدیل نہیں کیا بلکہ میرا پروگرام پہلے سے یہی تھا۔"

گاڑی ایک کشادہ کوٹھی کے پورچ میں رُکی اور امینہ کی والدہ اور چند خواتین نے باہر نکل کر بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں بالائی منزل کے ایک بڑے کمرے میں لے گئیں۔ یہاں پندرہ بیس لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ امینہ نے باہر نکل کر ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کہا "تم نے ٹھیک گیارہ بجے یہاں سے میاں عبدالرحیم کے گھر روانہ ہو جانا ہے۔ انھیں، بچّوں اور نوکر کو یہاں پہنچانے کے بعد اگر تم دیکھو کہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب اور ان کی بیگم یہاں نہیں آئے تو جا کر اُنھیں بھی لے آنا۔ راستہ دکھانے کے لیے یوسف صاحب کے نوکر کو ساتھ لے جانا لیکن اچھی طرح دیکھ لینا یہ بات نہ ہو کہ وہ یہاں بیٹھے ہوئے ہوں اور تم شہر میں بھاگتے پھرو۔ جانے سے پہلے یوسف صاحب سے پوچھ لینا۔ انھیں

جانتے ہو نا۔"

"جانتا ہوں جی۔ یہ وہی ہیں نا جو اُس دن آپ کی کار پر بیٹھنے کی بجائے تانگے پر کہیں چلے گئے تھے اور بی بی جی اُن کے متعلق تو میں بہت کچھ سن چکا تھا۔"

"کیا سُنا تھا تم نے۔"

"یہی کہ بڑے بڑے ڈاکو ان کے نام سے ڈرتے ہیں۔"

"ڈاکوؤں کا قصہ تمہیں فضل دین نے بتایا ہو گا۔؟"

"ایک قصہ بی بی جی؟ وہ تو جب بھی گاؤں سے آیا کرتا تھا کوئی نئی کہانی سنایا کرتا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد مہمان آنے شروع ہو گئے۔ اور بالائی منزل کے دو کمرے خواتین سے اور نچلی منزل کے تین کمرے مردوں سے بھر گئے۔ خواتین کے لیے کھانے کا اہتمام بالائی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں تھا اور مردوں کے لیے نیچے دو کمروں میں شہر کے کاروباری اور خوشحال لوگوں کی خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔ بڑے بڑے سرکاری افسر بھی وہاں موجود تھے اور ان کی بیگمات بھی وہاں آئی ہوئی تھیں۔ کھانا شہر کے مشہور باورچیوں نے تیار کیا تھا اور ہر طرف اس کی تعریف ہو رہی تھی۔ خواتین کی محفل میں سب کی نگاہیں فہمیدہ پر مرکوز تھیں اور رشیدہ سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا جا رہا تھا۔" وہ کون ہے رشیدہ؟"

"وہ ایک پولیس افسر کی بھتیجی ہے۔"

"پولیس افسر اسی ملک کا ہے؟"

"ہاں۔ اسی ملک کا ہے۔"

"اری بہن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی انگریز ہو گا۔"

"نہیں جی۔ انگریز نہیں ہے وہ۔"

"بہن میں بھی یہی سمجھاتی تھی کہ انگریز لڑکی ایسی خوب صورت نہیں ہوتی!" یہ

اُس کا رنگ دیکھتی ہیں چہرے کا نور نہیں دیکھتیں۔"

ایک لڑکی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔" امینہ! تم نے اس لڑکی کی ماں دیکھی ہے۔"

"جی اُس کے دائیں طرف اُس کی ماں ہی تو کھڑی ہے۔"

"باپ بھی آیا ہوا ہے اُس کا؟"

"نہیں۔ اُس کا باپ دیکھنے کے لیے تمہیں جالندھر جانا پڑے گا۔"

عورتیں ہنس پڑیں اور لڑکی پریشان ہو کر بولی۔" میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ اُس کا باپ کیسا ہے۔ اگر اُس کا رنگ بھی اس کی ماں جیسا ہے تو پھر کسی کو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔"

قدسیہ جو اس بحث کو دلچسپی سے سُن رہی تھی بولی" بیٹی اگر تم ان کی نانی کو دیکھ لو تو پھر تمہیں کوئی حیرت نہیں رہے گی۔"

نوجوان لڑکی نے کہا" کہاں ہیں اس کی نانی صاحبہ؟"

"ذرا دائیں طرف دیکھئے۔"

لڑکی نے دائیں طرف دیکھا اور اچانک اُس کی نگاہیں مسز احمد پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ پھر وہ قدسیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"جی میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ اس لڑکی نے اپنی نانی سے بہت کچھ لیا ہے۔ لیکن آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے؟"

"بیٹی اگر میں یہ کہوں کہ اس بچی اس کی نانی اور والدہ سے میری ملاقات کل ہی ہوئی تھی تو آپ کو یقین آجائے گا؟"

دراز قامت لڑکی مسکرائی" جناب! آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ آپ سے اُس بزرگ عورت کی بڑی مشابہت ہے۔"

قدسیہ نے کہا "بہن صفیہ ایک بات اور سُن لو۔ یہ صاحبزادی بھی یہی کہتی ہیں کہ آپ کی امّی مجھ سے بہت ملتی ہیں "۔

"بہن ہم سب ہی کہتے ہیں کہ امی جان کی شکل آپ سے بہت ملتی ہے اور کوئٹہ میں بھی پہلی بار یوسف نے امی کو دیکھ کر یہی کہا تھا "۔

"مجھے اُس نے بتایا تھا"۔

کھانے کے اختتام پر تھوڑی دیر باتیں کر کے مہمان یکے بعد دیگرے رخصت ہونے لگے تو رشیدہ نے چراغ بی بی سے کہا "چراغ بی بی صفیہ کی امی کو میرے کمرے میں لے جاؤ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ بہن قدسیہ آپ بھی وہیں جا کر آرام کریں۔ میں باقی مہمانوں کو رخصت کر کے آپ کے ساتھ آرام سے باتیں کروں گی "۔

چراغ بی بی نے مسز احمد کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور وہاں سے چل پڑی۔

قدسیہ نے دبی زبان میں صفیہ سے کہا "بہن بظاہر چراغ بی بی میں کوئی بُرائی نہیں مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے اچھی کیوں نہیں لگتی۔ ابھی آپ کی امی کے پاس بیٹھے ہوئے بھی وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ بے وقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ شکر ہے کہ اُسے معزز عورتوں کے ساتھ بیٹھنے کا شوق ہے اور ہماری فہمیدہ سے دُور رہی۔ ورنہ جب وہ بے وقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہے تو فہمیدہ بڑی پریشان ہوتی ہے۔ مَیں تو یہ بھی دُعا کرتی ہوں کہ آپ کی امّی جان اس کی نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ چلیئے اُن کے پاس چلتے ہیں۔ فہمیدہ بیٹی سے باتیں کرنے کا بھی اسے بڑا شوق ہے۔ ذرا حوصلہ افزائی ہوئی تو بہت پریشان کرے گی "۔

بلقیس بولی "آپا جی آپ چلیں تو سہی اگر دو منٹ کے بعد وہ خاموشی سے باہر نہ نکل آئے تو میرا نام بلقیس نہیں "۔

" صفیہ نے کہا "آپا قدسیہ تھوڑی بہت تعلیم یافتہ ضرور ہو گی وُہ آج لباس میں

تو نئے فیشن کا بہت خیال رکھا ہے اُس نے "۔

" بہن تعلیم تو شاید اس نے دسویں جماعت میں چھوڑ دی تھی لیکن ہوشیار بہت ہے "۔

چراغ بی بی کمرے میں داخل ہوئی تو مسز احمد اُونگھ رہی تھیں۔

"ماں جی! آپ کی ٹانگیں دبا دوں "۔

"بھئی میں ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ میرا نیند سے بُرا حال ہو رہا ہے "۔

"ماں جی اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے سر پہ کدو کے تیل کی مالش کر دیتی ہوں۔ ہمارے حکیم طارق علی صاحب کہتے تھے کہ کدو کے خالص تیل کی مالش سے دماغ کھل جاتا ہے "۔

" بھئی بھاڑ میں جائیں تمہارے حکیم طارق علی۔ انہوں نے کیوں لگا دیا تمھیں میرے پیچھے "۔ وہ سب کمرے میں داخل ہوئیں اور قدسیہ نے آگے بڑھ کر کہا "خالہ جی۔ یہ طارق کون ہے ؟"

"ہو گا اس کا کوئی۔ سر کھا لیا ہے اس نے میرا "۔

"خالہ جی۔ اگر طارق علی اس کا کوئی ہے تو اسے طارق کا سر کھانا چاہیے۔ جاؤ بی بی انھیں آرام کی ضرورت ہے "۔

چراغ بی بی اُٹھی اور اپنا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔

صفیہ نے کہا "بہن میں نے ایک عجیب بات دیکھی ہے۔ لوگوں کا رنگ غصّے میں سرخ ہو جاتا ہے لیکن اس کا رنگ بھی زرد تھا اور آنکھیں بھی خوف زدہ گائے کی طرح سفید نظر آتی تھیں "۔

مسز احمد اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ قدسیہ نے کہا "خالہ جان مجھے افسوس ہے کہ اُس نے آپ کی نیند خراب کی "۔

”ارے بیٹی! نیند کہاں آرہی تھی مجھے میں تو اس کی باتوں سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی“۔

صفیہ بولی ”امی جان! آپ بھی اس سے نفرت کرتی ہیں“۔

بیٹی ”میری نفرت کے لیے یہ کافی نہیں کہ قدسیہ اُسے اچھا نہیں سمجھتی“۔

کچھ دیر وہ باتیں کرتی رہیں پھر یوسف نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

”امی جان میرا خیال ہے اباجان کچھ دیر اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں میں مصروف رہیں گے۔ آپ بھی کچھ دیر آرام کرلیں“۔

”نہیں بیٹا۔ تم ان سے کہو میں گھر جاتی ہوں اور وہ بھی انہیں رخصت کرنے کے بعد جلد پہنچ جائیں“۔

یوسف مڑنے لگا تو مسز احمد نے آواز دی ”بیٹا! جاؤ نہیں میں نے ایک بات کرنی ہے“۔

یوسف کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ”فرمایئے ماں جی“۔

”بیٹا میں تمہیں نصیحت کرنے کا حق رکھتی ہوں نا“

”ماں جی مجھے ہمیشہ آپ کی نصیحتوں کی ضرورت رہے گی“۔

”بیٹا میری یہ بات یاد رکھنا کہ زندگی میں تمہارے لیے وہی بات اچھی ہوگی جسے تمہاری ماں اچھا سمجھتی ہو۔ یہ اتنی معصوم ہے کہ اسے دوسروں کی چھوٹی چھوٹی خوبیوں پر بھی پیار آتا ہے اگر کسی کو یہ اچھا نہیں سمجھتی تو تمہارے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ وہ تمہارا خیر خواہ ہو سکتا ہے“۔

”مجھے معلوم ہے ماں جی اور امی جان کو یہ معلوم ہے کہ کسی کو پسند یا ناپسند کرنے سے پہلے میں ان کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس گھر کے بعض لوگوں کو دیکھ کر آپ خوش نہیں ہوں گی لیکن اباجی کی وجہ سے امی جان کو اور

اور امی جان کی وجہ سے مجھے کچھ لحاظ آگیا تھا اور شاید میری وجہ سے آپ کو کچھ زحمت اٹھانی پڑی“۔

”ارے بیٹا کیا بات کرتے ہو۔ میں تو بہت خوش ہوئی ہوں یہاں آکر۔ مجھے یوں ہی خیال آیا تھا کہ تمہارے جیسے نیک نیت لوگوں کو بہت سوچ بچار کے بعد کسی پر اعتماد کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو لوگ دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ انہیں ذرا مشکل سے بُرے لوگوں کا اصلی چہرہ نظر آتا ہے“۔

”ماں جی۔ میری امی کا چہرہ ایک آئینہ ہے جس میں میں ہر اچھے اور بُرے کی اصلی صورت دیکھ لیتا ہوں“۔

رشیدہ امینہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے کہا ”خالہ جی! اُس بے وقوف نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا۔ اصل میں غلطی میری تھی کہ میں نے اُسے آپ کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی“۔

مسز احمد بولی ”نہیں بیٹی پریشان تو وہ میرے روکھے پن کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ وہ باتیں کرکے مجھے خوش کرنا چاہتی تھی لیکن مجھ پر آپ کے لذیذ کھانوں کا یہ اثر تھا کہ میں فوراً سو جانا چاہتی تھی۔ اُس نے میرے سر پہ مالش کے لیے کسی حکیم صاحب کے کدو کے تیل کی تعریف کی تھی اور میں نے شاید حکیم صاحب کو کچھ کہہ دیا تھا۔ پھر یہ سب آگئیں اور شاید بلقیس کی کسی بات نے اسے ذرا ناراض کردیا۔ بہرصورت وہ اچھی لڑکی ہے اور میں جانے سے پہلے اس کا شکریہ ادا کروں گی“۔

امینہ بولی ”ماں جی اس بے وقوف کو آپ سے معافی مانگنی پڑے گی۔ اس نے یقیناً آپ کو بہت پریشان کیا ہوگا“۔

”نہیں بیٹی۔ ہماری خاطر تمہیں اس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آپ لوگ باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتے۔ اسے باقاعدگی سے نماز

پڑھایا کرو۔ وہ خود بھی خوش رہے گی اور تمہیں بھی خوش رکھا کرے گی۔"

رشیدہ نے کہا خالہ جان "میں امینہ کے آپا کی طرف سے یہ درخواست لے کر آئی ہوں کہ کانگڑہ سے واپسی پر آپ کم از کم پورا ہفتہ ہمارے پاس ٹھہریں۔ امینہ آپ کو خوب سیر کرائے گی۔"

"بیٹی میں یہ وعدہ نہیں کرتی کہ اتنے دن ٹھہروں گی لیکن آؤں گی ضرور۔"

"میرا مطلب ہے کہ آپ سب آئیں گے۔ صفیہ بھی اور اس کے بچے بھی۔"

"بھئی صفیہ سے تو شاید تم پہلے ہی وعدہ لے چکی ہو لیکن اس کے لیے شاید ایک ہفتہ والی بات ذرا مشکل ہوگی۔"

شام کے وقت قدسیہ، یوسف عبدالعزیز اور اس کی بیوی بلقیس مہمانوں کو ریلوے اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تھے۔ جب وہ سیکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبے میں بیٹھ گئیں تو قدسیہ نے اپنے نوکر کے ہاتھ سے ایک گٹھڑی لے کر مسز احمد کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ چھوٹا سا تحفہ قبول فرمائیے۔ سبز رنگ کے ریشمی رومال میں جو دو سوٹ ہیں ان میں سے ایک آپ کے لیے اور ایک بہن صفیہ کے لیے ہے۔ دوسرے سفید رومال میں فہمیدہ اور نسرین کے کپڑے ہیں۔ میں نے آپ کے لیے عطر کی دو شیشیاں بھی منگوائی تھیں لیکن جیسا عطر آپ نے کوئٹہ سے مجھے یوسف کے ہاتھ بھیجا تھا ویسا یہاں سے نہیں ملا۔ بہرحال میرے یہ تحائف قبول فرمائیے۔ میں اپنے گھر پر ہی انہیں آپ کے سامان میں رکھوانے کی کوشش کرتی لیکن میں ڈرتی تھی کہ کہیں خالہ جان انکار نہ کر دیں۔ اس امید پر یہاں پہنچ کر آپ کو پیش کر رہی ہوں کہ آپ خلقِ خدا کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں کریں گی۔"

"ارے بیٹی۔ آخر تم نے مجھے ہوا کیوں سمجھ لیا ہے۔ فہمیدہ یہ تحائف سنبھال کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لو۔ میں اطمینان سے دیکھوں گی اور صفیہ تم کیوں خاموش ہو۔ شکریہ ادا کرو اپنی بہن کا۔"

"خالہ جان"۔ قدسیہ نے کہا۔ "صفیہ کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے قدرت کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے دیکھے بغیر میرا تحفہ قبول کر لیا ہے۔"

یوسف چند قدم پیچھے کھڑا ہو کر عبدالعزیز سے باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور وہ قریب آ گئے۔ قدسیہ اور صفیہ دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ گاڑی چل پڑی اور وہ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے لگے۔

یوسف ڈبے کے سامنے سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ بلقیس، عبدالعزیز اور قدسیہ ہاتھ ہلا کر رخصت ہونے والوں کے الوداعی اشاروں کا جواب دے رہی تھیں۔ فہمیدہ کھلے دروازے میں کھڑی تھی اور یوسف اطمینان سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب گاڑی ذرا آگے نکل گئی تو اُس نے دل میں خدا حافظ خدا حافظ کہتے ہوئے ایک ہاتھ بلند کر دیا۔

عبدالعزیز، بلقیس، یوسف اور اس کی امی کو کار پر اُن کے گھر تک پہنچا کر گئے اور رخصت ہوتے وقت عبدالعزیز نے کہا۔ "میں نے ڈرائیور کو کہہ دیا ہے کہ کل سے آپ کو باقاعدہ ڈرائیونگ سکھانا شروع کر دے گا۔ آپ اس کے لیے صبح یا شام کا کوئی وقت مقرر کر لیں۔ یہ آپ کو باقاعدہ ہر روز دو گھنٹے کے لیے ساتھ لے جایا کرے گا۔ میں صبح نماز کے لیے تیار ہو جایا کروں گا اور ڈرائیور کے ساتھ ناشتہ کر کے اس کے ساتھ چل پڑا کروں گا اور اگر یہ کوئی دقت محسوس کرے تو ہم عصر کی نماز کے بعد پروگرام بنا لیا کریں گے۔"

ڈرائیور نے کہا "جناب صبح کے وقت ٹھیک رہے گا۔"

"اچھا تو ہم کل نہیں پرسوں سے شروع کریں گے۔"

اگلے دن دس بجے کے قریب یوسف اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا کہ ماں اُس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے ایک پیکٹ یوسف کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔"یہ پیکٹ میں نے کھول کر دیکھے بغیر گھر پہنچتے ہی اپنے ٹرنک میں رکھ لیا تھا۔ پھر اُن کے یہاں ہوتے ہوئے مجھے ان کی تصویریں دیکھنے کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی۔ اب جب تم سیر کے لیے نکلے تھے تو میں نے یہ پیکٹ کھولا تھا۔ نسرین اور فہمیدہ کی شکلیں بہت ملتی ہیں لیکن فہمیدہ اتنی حسین ہے کہ اُس کی کوئی تصویر اُس جیسی نہیں ہوسکتی۔"

یوسف نے بظاہر بے پروائی سے یکے بعد دیگرے تمام تصویریں دیکھیں اور انہیں پیکٹ میں ڈالنے کے بعد مسکرا کہا۔"امی جان بات دراصل یہ ہے کہ کیمرے کی بے جان آنکھ میں ماتا نہیں آسکتی اور آپ تو فہمیدہ اور اس کی نانی کو بھی یہ شاید احساس دلا چکی ہیں کہ اُس کے لیے آپ کی ماتا کسی سے کم نہیں۔ لیکن امی جان آپ اُسے دیکھتے ہی کیوں رو پڑی تھیں؟"

"بیٹا وہ خوشی کے آنسو تھے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں مدتوں سے اُسے تلاش کر رہی تھی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اُس کی ماں اور نانی ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے اجنبی محسوس نہیں ہوئیں۔ میں اس کی وجہ بیان نہیں کر سکتی لیکن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ میری ہیں شاید اُس کی یہ وجہ ہو کہ میں نے اُن سب کی نگاہوں میں تمہارے لیے پیار دیکھا تھا اور میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ تمہیں اُن لوگوں سے پیار ملے گا۔ بیٹا پہلے شاید میں یہ بات تم سے نہ کہتی لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں انہیں دیکھنے سے پہلے ایک بات سے خوفزدہ تھی۔"

"کس بات سے امی جان؟"

"بیٹا! میں اس بات سے خوف زدہ تھی کہ میں اتنی بے بس نہ ہو جاؤں کہ

تمہارے ابا جان کسی دن تمہارے مستقبل کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ کر دیں کہ میری روح کی چیخیں آسمان تک جا پہنچیں لیکن میں زبان بھی نہ ہلا سکوں۔"

"امی جان آپ کبھی بھی بے بس نہیں ہوں گی اور میں آپ کا کوئی بھی فیصلہ رد نہیں ہونے دوں گا۔ اگر آپ کو ساری دنیا سے بے اطمینانی ہو جائے تو بھی مجھ پر آپ کو اعتماد کرنا چاہیے۔"

"بیٹا مجھے تم پر اعتماد ہے لیکن میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ تمہارے ابا جان کہیں دنیا داری کے چکر میں نہ پڑ جائیں لیکن نہیں مجھے ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔"

یوسف مسکرایا۔"امی جان جو باتیں آپ کہنا چاہتی ہیں وہ آپ کے چہرے پر لکھی ہوئی ہیں۔ آپ یہی کہنا چاہتی ہیں نا کہ دنیا داری کا چکر ابا جان کو عبدالکریم کی طرف کھینچ لے گا۔ لیکن مجھے اپنی ہمت سے زیادہ آپ کی دعاؤں پر یقین ہے اور آپ کی دعائیں مجھے اس راستے پر کبھی نہیں جانے دیں گی جو آپ کو پسند نہیں، امی جان میں ہوش سنبھالتے ہی اپنے متعلق آپ کی جو دعائیں سُنا کرتا تھا، ان میں سے ایک بار بار دہرائی جانے والی دعا معصوم پاکیزہ اور خوب صورت لڑکی کے نقوش میرے ذہن میں اُبھارا کرتے تھے۔ اُس سے آپ مل چکی ہیں اور میں بھی اُسے دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی دُعاؤں کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ وہ بھولی بھالی لڑکی بھی یہ جانتی ہے کہ میں جو کچھ ہوں اُس کے لیے ہوں۔ مجھے کسی دن صرف اس کے والدین کو یہ کہنا پڑے گا کہ اگر زمانے کے حوادث کے باعث کامیابی کی منزل کی طرف میرا راستہ طویل ہو جائے تو میرا سب سے بڑا سہارا یہ ہوگا کہ وہ میرا انتظار کرے گی۔ دوسری لڑکی امینہ کے بارے میں اگر آپ کو کوئی پریشانی ہے یا ابا جان کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہے تو وہ بہت جلد دُور ہو جائے گی۔ میں کسی دن اس سے براہ راست بات کروں گا آپ اور اُس کی ماں سُن سکیں گی اور اگر ضرورت پڑی تو میں عبدالکریم صاحب سے

بات کروں گا۔ میرے لیے یہ مسئلہ قطعاً پیچیدہ نہیں۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹا! جب میں تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو میری تمام پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔"

"امی جان پھر میری طرف دیکھتی رہا کریں نا۔"

"ارے بیٹا میں زندہ ہی اِس لیے ہوں کہ تمہیں دیکھا کرتی ہوں لیکن ابھی وُہ تصویریں تمہیں چھپا کر رکھنی چاہئیں۔ جب وہ گاڑی پر روانہ ہوتے تھے تو مجھے خیال آیا تھا کہ اُن سے یہ کہوں کہ شاید میں یوسف کو بھی کسی دن کانگڑہ سیر کے لیے بھیج دوں۔"

"نہیں امی جان۔ ابھی نہیں، ابھی میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"بیٹا کسی دن تم اُداس نہیں ہو جاؤ گے؟"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ بیٹا کیسے اداس ہو سکتا ہے جس کے لیے آپ جیسی ماں دعائیں کرتی ہو!"

ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "اللہ تمہیں ہر میدان میں کامیابی دے اور پھر میں تمہارے ساتھ بہت سیر کیا کروں گی۔ پھر وہ مبارک دن بھی آئے گا جب فہمیدہ ہمارے ساتھ ہوا کرے گی۔"

"امی جان۔" یوسف نے کچھ سوچ کر کہا۔ "فہمیدہ کو دیکھے بغیر آپ کے دل میں اس کا خیال کیسے پیدا ہوا تھا؟"

"بیٹا۔ جب تم نسرین کا ذکر کر رہے تھے تو میں دل میں کہہ رہی تھی کاش اُس کی کوئی بڑی بہن ہو، پھر جب تمہاری گفتگو سے یہ پتہ چلا کہ ایک بڑی بہن بھی ہے جس کی نسرین اور اس کی نانی دونوں تعریف کرتی تھیں۔ تو میرے دل میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ یہی وہ لڑکی ہو سکتی ہے جسے میں تصور میں دیکھا کرتی تھی اور نسرین کے پہلے خط میں اُس کے ہاتھ کی چند سطریں پڑھنے کے بعد تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اللہ نے میری دعائیں سن لی ہیں لیکن بیٹا مجھے

تم سے ایک شکایت ہے کہ تم پڑھائی میں اپنے ابا جان کی توقعات پوری نہیں کر رہے۔ کیا تم اپنے ابا جان اور ہم سب کی خوشی کے لیے اس سال ذرا زیادہ محنت نہیں کر سکتے۔"

"امی جان بی اے کے امتحان کا نتیجہ دیکھنے کے بعد اباجی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔"

"بیٹا اگر تم نے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی تو میں اور تمہارے ابا جان بلا تاخیر فہمیدہ کے گھر جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ بلقیس اور اس کے میاں یہ سفارش کریں گے کہ ہماری درخواست قبول کر لی جائے۔"

"لیکن امی جان بی اے کے بعد میرے جو ارادے ہیں انھیں پورا کرنے کے لیے مجھے دو چار سال بہت کام کرنا پڑے گا۔"

"بیٹا میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں لیکن میرا مقصد ان کے والدین کی رضامندی حاصل کرنا ہے۔ پھر ایسی بہو کے انتظار میں دو چار سال ایک دل کش خواب کی طرح گذر جائیں گے اور تم بھی پوری یکسوئی سے اپنا کام کر سکو گے۔ پھر میں اُسے خط لکھا کروں گی۔ عیدوں پر اسے تحائف بھیجا کروں گی اور سوتے جاگتے تم دونوں کے لیے دعائیں کیا کروں گی۔ میرے لیے کتنے خوشی کے دن ہوں گے وُہ۔"



دس دن بعد قدسیہ کو ایک لفافہ موصول ہوا جس کے اندر ایک خط صفیہ کی طرف سے تھا اور دوسرا یوسف کے لیے نسرین کی طرف سے۔ صفیہ نے اپنے خط میں اپنی ماں اور فہمیدہ کی طرف سے اُن کی مہمان نوازی اور تحائف کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ لکھا تھا۔

"بہن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گی کہ جب گاڑی بٹالہ سے آگے ایک اسٹیشن

پر رُکی تو فہمیدہ نے ایک کارخانے کی بلند چمنی دیکھتے ہی کہنا شروع کر دیا کہ اس سٹیشن سے مشرق کی طرف یوسف صاحب کا گاؤں ہے۔ ہم دائیں ہاتھ گاڑی کی کھڑکیوں سے مشرق کی طرف دیکھنے لگے۔ تین سکھ عورتیں جو اس اسٹیشن سے سوار ہوئیں تھیں ہماری باتوں میں دلچسپی لینے لگیں۔ جب میں نے آپ کے گاؤں کا نام لیا تو "بہن"! ایک عورت نے کہا۔" اگر آپ نے اِس گاؤں جانا ہے تو یہیں اتر جائیں اگلا اسٹیشن تو بہت دُور ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔" نہیں جی ہم نے وہاں نہیں جانا صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ وُہ گاؤں کس طرف ہے۔" ایک نوجوان لڑکی جلدی سے ہمارے قریب آ گئی اور اُس نے بازو نکال کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" جی وہ سامنے ہمارے گاؤں کے درخت ہیں اور دوسرا گاؤں جس کا آپ پوچھ رہی ہیں اُس کے پیچھے ذرا دائیں طرف ہے۔ وہاں آپ کسی کو جانتی ہیں۔"

میں نے کہا۔" ہاں بیٹی۔ ہم میاں عبدالرحیم ان کے بیٹے یوسف اور اُن کی بیگم صاحبہ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔" یہ سُن کر باقی دو عورتیں بھی ہمارے پاس آ گئیں اور اُنھوں نے میاں صاحب کے خاندان کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ فہمیدہ نے اچانک نوجوان لڑکی سے پُوچھا۔" ہم یہاں سے پردیسی درخت دیکھ سکتی ہیں۔"

"جی وہ ایک بڑے گاؤں کے پیچھے ہیں۔"

فہمیدہ نے پوچھا" پردیسی درختوں کی خاص بات کیا ہے۔"

لڑکی نے کہا۔" جی وہ بہت پرانے ہیں۔ کہیں دُور سے چل کر آئے تھے، تھک کر وہاں رُک گئے تھے۔"

فہمیدہ بولی۔" جی تھک کر نہیں۔ بات یہ تھی کہ بہت سویرے ایک عورت نے آٹا پیسنے والی چکی چلاتے ہوئے باہر دیکھا تو درخت بھاگتے جا رہے تھے۔ وہ

دہائی دینے لگی تو درخت جہاں تھے وہیں رُک گئے۔"

فہمیدہ نے پوچھا" کیا یہ درست ہے کہ بعض درختوں میں کھوڑ ہے جن میں سانپ رہتے ہیں۔"

لڑکی نے جواب دیا" جی سانپ ہی نہیں وہاں خوفناک جنگلی بلے بھی ڈیرہ جما لیتے ہیں۔ ایک بلا اِتنا بڑا تھا کہ اس نے دو کتے جان سے مار ڈالے اور ہمارا ایک قیمتی کتا بری طرح زخمی کر دیا تھا۔"

فہمیدہ نے پوچھا۔" آپ کا گاؤں یوسف صاحب کے گاؤں سے مغرب کی طرف ہے؟ اور پردیسی درخت وہاں سے جنوب کی طرف ہیں۔"

"جی ہاں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمارا علاقہ دیکھ چکی ہیں۔"

" اچھا یہ بتایئے بہن کہ سردار بیلا سنگھ آپ کے کیا لگتے ہیں۔"

لڑکی۔" جی وہ میرے پتا ہیں اور میرا نام جیت کور ہے۔"

بڑی عمر کی عورت نے کہا" بیٹی اگر آپ اتنا کچھ جانتی ہیں تو میاں عبدالرحیم کے خاندان سے آپ کا کوئی رشتہ ہو گا۔ جب آپ ان کے پاس آئیں تو ہمیں ضرور اطلاع دیں۔"

"میں نے یونہی سوال کر دیا۔ آپ ان کے بیٹے یوسف کو اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"جی اُسے کون نہیں جانتا۔ اچھے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں اور جو بُرے ہیں وہ اُن کے سائے سے بھاگتے ہیں۔"

اِن لوگوں سے گفتگو بہت دلچسپ رہی لیکن جلد ہی وہ دوسرے اسٹیشن پر اُتر گئیں۔

بہن پردیسی درختوں کے ذکر سے امّی جان کو آپ کے گاؤں سے اتنی دلچسپی
پیدا ہوگئی ہے کہ اگر اگست کے آخری دنوں میں آپ لوگ اپنے گاؤں میں ہوں تو
ہم واپسی پر آپ کا گاؤں ضرور دیکھیں گے۔ اگر کوئی پروگرام ہے تو ہمیں اطلاع دیجئے۔
اور کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کسی دن چپکے سے دھرم سالہ پہنچ جائیں اور ہماری سب
کی عید ہو جائے۔

آپ کی بہن صفیہ

نسرین نے لکھا تھا۔

میری پیاری خالہ جان

جب آپا فہمیدہ نے آپ کا قیمتی تحفہ مجھے دیا تو رنگ وہی تھا جو میرے ابّو
اور امّی پسند کیا کرتے ہیں اور وہ کہتی تھیں کہ آپ اُن بزرگوں میں سے ہیں جو
دیکھے بغیر بچّوں سے پیار کرنے لگ جاتے ہیں۔ خالہ جان! یہ بھی عجیب بات ہے
کہ جب یوسف بھائی نے نانی جان سے کہا تھا کہ آپ کی صورت بالکل میری امّی
سے ملتی ہے تو میں نے بھی آپ سے پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوسف بھائی جان
سے میں سخت ناراض ہوں۔ آپ انہیں اس بات پر تھوڑا سا ضرور ڈانٹیں کہ انہوں
نے اپنی ننھی بہن کا پتہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ یہ تو آپا فہمیدہ کا کمال تھا کہ انہوں
نے کسی اخبار میں اُن کا مضمون پڑھا اور مجھ سے پرنسپل صاحب کے نام خط لکھوا دیا۔
جب مجھے یہ خیال آتا تھا کہ بھائی یوسف مجھے بھول گئے ہوں گے تو میں بیان نہیں کر سکتی
کہ مجھے کتنا دُکھ ہوتا تھا۔ خالہ جی زیادہ دکھ مجھے اِس بات کا ہے کہ میرے شیر دل بھائی جان
نے اتنے بڑے کارنامے سرانجام دیئے اور مجھے خبر بھی نہ تھی اور جب مجھے یہ پتہ چلا کہ چچا جان
انہیں اچھی طرح جانتے تھے تو کتنا غصّہ آیا تھا مجھے اُن پر۔ خالہ جان آپ کو دیکھنے کو بہت

جی چاہتا ہے اور اس وقت تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے جب آپا، امی اور نانی جان آپ کے
متعلق باتیں کرتی ہیں اور اس طرح ذکر کرتی ہیں۔ جیسے میں یوسف بھائی جان کو بالکل نہیں
جانتی۔ خالہ جان میں نے ایسے ہی لکھ دیا ہے کہ آپ میرا دل دکھانے پر ان کی ڈانٹ ڈپٹ
کریں ورنہ میں اُن سے بالکل ناراض نہیں ہوں اور کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ خالہ جان بھائی
جان کو بھی تو چھٹیاں ہیں اور کانگڑہ کا موسم بہت اچھا ہے یا تو آپ اس طرح کریں کہ بھائی
جان کے ساتھ یہاں آجائیں یا بھائی جان کو بھیج دیں تاکہ مجھے آکر آپ کے پاس لے جائیں۔
میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو دیکھنے کی خوشی مجھے لاہور کی گرمی محسوس نہیں ہونے
دے گی۔ بھائی جان سے کہہ دیجئے کہ میں اس یقین کے ساتھ ہر نماز کے بعد دعا کرتی
ہوں کہ گاڑی پر سفر کے دوران میرے لیے دعا کرنے کا جو وعدہ انہوں نے کیا تھا
وہ انہیں نہیں بھولا ہوگا۔

اور پیاری خالہ جان اب میں بھائی جان کے ساتھ آپ کی صحت اور سلامتی
کے لیے بھی دعا کیا کروں گی۔ آپا فہمیدہ آپ سب کو سلام کہتی ہیں۔

آپ کی بیٹی

نسرین

نسرین کا خط آنے کے بعد کوئی ایک ہفتہ قدسیہ فرصت کے اوقات
میں الگ بیٹھ کر انہیں خطوط لکھا کرتی تھی۔ پہلے تین دن وہ صفیہ اُس کی امی اور
نسرین کے نام لکھتی رہی۔ چوتھے روز اُس نے فہمیدہ کو لکھا لیکن اُسے اپنی تحریر
پسند نہ آئی اُس دن گرمی بہت زیادہ تھی لیکن شام کے وقت اچانک شدید آندھی
آئی اور اُس کے بعد موسلادھار بارش ہونے لگی۔ صبح کے وقت موسم بہت خوشگوار

تھا۔ قدسیہ یہ کہہ کر اُوپر کمرے میں چلی گئی" مَیں آرام کرنا چاہتی ہوں اِس لیے
جب تک میں خود نہ اُٹھوں مجھے جگانے کے لیے کوئی نہ آئے۔"

یوسف جو کسی دوست کے گھر گیا ہوا تھا اپنے بھائی سے یہ سُن کر پریشان
ہوا کہ امّی جان آپ کے گھر سے نکلتے ہی آرام کے لیے اوپر چلی گئیں تھیں اور یہ حکم
دے گئیں تھیں کہ جب تک میں خود نہ نیچے آؤں مجھے بلانے کے لیے کوئی نہ آئے۔
پھر اُس نے بہن سے کہا" صغریٰ دبے پاؤں جاؤ دیکھو امّی جان کی طبیعت تو ٹھیک
ہے نا"

اُس نے واپس آکر جواب دیا" بھائی جان! انھوں نے اندر سے دروازے
کی کنڈی لگا رکھی ہے"

"تم نے آہستہ سے آواز نہیں دی؟"

"جی نہیں"۔

یوسف بھاگتا ہُوا اُوپر چڑھا اور اُس نے بالائی منزل کے دو کشادہ کمروں
میں سے ایک کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا" امی جان۔ امّی جان"۔

ماں نے اندر سے کہا" بیٹا میں ٹھیک ہوں۔ نوکر سے کہو وہ کھانا تیار
کرے میں ابھی آجاؤں گی"۔

"امی جان آپ آج بھی کچھ لکھ رہی ہیں"۔

"ہاں بیٹا، سب سے اہم خط تو مَیں آج لکھ رہی ہوں۔ بس تھوڑا سا رہ گیا ہے
اِس کے بعد وہ چاروں خط جو مَیں نے لکھے ہیں آکر پڑھ لینا اور لفافوں پر ان کے پتے
لکھ کر آج ہی پوسٹ کر آنا"۔

"چوتھا خط کس کے نام ہے امّی جان"۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ کس کے نام ہے۔ اب جاؤ ورنہ بہت سی باتیں لکھنا بھول

جاؤں گی"۔

"اچھا امی جان مَیں جاتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کوئی بات نہیں
بھولیں گی"۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد یوسف ایک کتاب اُٹھا کر بیٹھک میں لیٹ گیا
ماں کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے چار خالی لفافوں کے ساتھ اپنے لکھے ہوئے
خطوط میز کی ایک دراز میں رکھتے ہوئے کہا" بیٹا! آرام کرنے کے بعد یہ چاروں
خط اچھی طرح پڑھ لینا اور پھر اُوپر والا خط جو مَیں نے ابھی ختم کیا ہے بڑی احتیاط
سے پڑھنا کوئی غلطی ہو تو ٹھیک کر دینا۔ مَیں نہیں چاہتی کہ کوئی فہمیدہ کے سامنے
میرا مذاق اڑائے"۔

"امی جان۔ آپ یہاں بیٹھ جائیں۔ وہ خط میں آرام کرنے سے پہلے
آپ کے سامنے پڑھوں گا۔ کیونکہ جس فہمیدہ کو میں جانتا ہوں اس کے سامنے
کوئی آپ کا مذاق نہیں اُڑا سکتا"۔

ماں نے دراز کھول کر خط نکالا اور یوسف کو دیتے ہوئے اُس کے پاس
بیٹھ گئی۔ یوسف اُٹھ کر خاموشی سے خط پڑھنے لگا۔ قدسیہ نے لکھا تھا کہ

میری بیٹی، آنکھوں کی روشنی سلامت رہو

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جن کی آواز سننے کے لیے کان ترستے ہیں، وہ
یکایک خاموش ہو جاتے ہیں۔ خدا معلوم کہ اِس میں کیا مصلحت تھی کہ تم مجھے چند
سطریں بھی نہ لکھ سکیں لیکن اس کے باوجود ہر خط تمہاری طرف سے ایک خوشی کا
پیغام محسوس ہوتا تھا۔ کل بہت گرمی تھی۔ میں نے سوچا کہ فہمیدہ نے نہیں لکھا تو
اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ میں بھی نہ لکھوں لیکن جو خط میں نے لکھا تھا وُہ

مجھے پسند نہ آیا اور شاید اس لیے پسند نہ آیا کہ سخت گرمی میں مَیں کانگڑہ کی
خوش گوار ہواؤں اور دل کش مناظر کا تصور کر رہی تھی اور ہر تصور کے ساتھ
میری نگاہوں کے سامنے تم آجاتی تھیں۔ مَیں نے اپنی تحریر پڑھی تو اُن فقروں
کے سوا جو میں نے تمہارے متعلق لکھے تھے مجھے ہر بات بے ربط نظر آتی تھی،
اور میں سوچتی تھی کہ تم ایسا خط پڑھ کر کیا کہو گی۔ چنانچہ مَیں نے پہلا خط ضائع کر دیا
پھر شام کو آندھی آئی اور کھل کر بارش ہوئی۔ اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میری
بیٹی کی دعاؤں نے کانگڑہ کی ہواؤں کا رُخ میری طرف پھیر دیا ہے تاکہ میں اطمینان
سے اُسے لکھ سکوں چنانچہ میں اُوپر تنہا بیٹھی ہوں اور نیچے یہ کہہ آئی ہوں کہ مجھے
آرام کی ضرورت ہے۔ اِس لیے کوئی اُوپر نہ آئے۔ مَیں نے تنہائی کے لیے
کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا لیکن بیٹی مَیں تنہا نہیں ہوں کیونکہ مجھے خط لکھتے
ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم کسی کونے میں چھُپ کر مجھے دیکھ رہی ہو۔ نسرین
کو مَیں نے لکھ دیا ہے کہ بہن صفیہ نے اجازت دی تو میں اُس کو یہاں لانے کا
کوئی انتظام کروں گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَیں خود یوسف کے ساتھ چل پڑوں
میرے لیے اِس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی کہ کانگڑہ سے
واپسی پر آپ ہمارے گاؤں میں رکیں اور میں آپ کی آمد سے چند دن پہلے
گھر پہنچ جاؤں۔ آپ کے ساتھ ملاقات سے پہلے میرے دل میں یہ خیال بھی
نہیں آیا تھا کہ میں اس سال اچانک کسی دن اپنے گاؤں جا سکوں گی۔ لاہور کے
ساتھ آتے دن میری دلچسپیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ لیکن اب یکا یک بڑی شدت
سے قدرت کی اُن نعمتوں کا احساس ہونے لگا ہے جو مَیں وہاں چھوڑ کر آئی ہوں۔
میں محسوس کرتی ہوں کہ جو آسمان جو چاند اور جو ستارے مَیں اپنے گاؤں میں دیکھا
کرتی تھی وہ اِس شہر سے بہت مختلف ہیں۔ جس فضا میں مَیں سانس لیا کرتی تھی وہ

یکسر بدل چکی ہے۔ یوسف کو اس بات کا احساس ہے کہ شہر کی ہوا کا مجھ پر اچھا
اثر نہیں پڑ رہا۔ وہ اپنے ابا جان کو بھی قائل کر چکا ہے کہ مجھے وقتاً فوقتاً دو چار دن
کے لیے گاؤں جا کر ضرور رہنا چاہیے۔

ہمارا پروگرام یہ ہے کہ اگست کے آخری دو ہفتے اپنے گاؤں میں گذار
آئیں۔ اس لیے پندرہ اگست کے بعد جس دن بھی تشریف لائیں یوسف آپ
کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود ہو گا۔ بیٹی زیادہ مناسب بات یہی ہو گی کہ
آپ کی امی بہن بلقیس یا اُن کے میاں کو لکھے کہ آپ کون سی تاریخ کو کانگڑہ سے
روانہ ہوں گی۔ ہماری کوشش تو یہی ہو گی کہ بلقیس اور بھائی عبدالعزیز بھی ہمارے
ساتھ چل پڑیں لیکن اگر انھیں کوئی مصروفیت ہوئی تو بھی مجھے یقین ہے کہ پردیسی
درختوں کے متعلق سننے کے بعد وہ یقیناً ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں گے۔

بیٹی اِس وقت عجیب و غریب باتیں آرہی ہیں میرے ذہن میں ایک فرضی
سی کہانی تو یہ ہے کہ 'پردیسی درخت' پہاڑوں کی طرف سے بھاگ کر اِس طرف آ
نکلے تھے اور رات کے پچھلے پہر چکی پیسنے والی عورت کی دُہائی سُن کر وہ اچانک وہیں
رُک گئے تھے۔ لیکن کسی دن جب ہمارے علاقے کے لوگ اپنے بڑوں کی زبانی یہ
سُنا کریں گے کہ دو شہزادیاں جن کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن
تھے ان درختوں کو دیکھنے آئی تھیں تو ان کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتّے سے
نغمے پھوٹ نکلے تھے تو کئی لوگ اس بات پر بھی یقین کر لیں گے۔

یوسف آخری الفاظ رُک رُک کر پڑھ رہا تھا اور ہر فقرے کے بعد اپنی ماں کی
طرف دیکھ رہا تھا۔ قدسیہ نے کہا "بیٹا اِس خط کو لفافے میں ڈالنے سے پہلے اچھی
طرح پڑھ لو۔ میں نے یقیناً کوئی غلطی کی ہو گی۔"

"نہیں امی جان۔ اِس خط کو کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ یہ خط پڑھنے سے پہلے

شاید میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ آپ اِتنا اچھا لکھ سکتی ہیں۔"

" اچھا بیٹا! اس پر تو میں نے خاص توجہ دی ہے مگر باقی خط ضرور دیکھ لو اور انھیں آج ہی روانہ کر دو۔"

باب - ۲۳

جولائی کے دن قدسیہ، یوسف اور اُس کے بھائی اور بہنوں کے لیے بڑی خوشی کے دن تھے۔

یوسف کی چچازاد زہرہ بہاول پور میں اپنے سسرال کے گھر سے ایک سالہ بچّے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔

کانگڑہ سے باقاعدہ خطوط آیا کرتے تھے اور ہر خط ان کی خوشیوں میں اضافہ کیا کرتا تھا۔ فہمیدہ نے جو طویل خط قدسیہ کے خط کے جواب میں لکھا تھا اُسے وہ کئی بار پڑھ چکی تھی اور یوسف کو بھی دکھا چکی تھی۔ اس خط میں براہِ راست اُس نے یوسف کے ذکر سے اجتناب کیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لکھتے وقت بظاہر اُس کی ماں سے مخاطب ہے لیکن اُس کے خیالات یوسف پر مرکوز ہیں اور قدسیہ جب جواب لکھتی تھی تو اُس کے مبہم سوالات کے جواب میں اُسے یوسف کا تذکرہ کرنا پڑتا تھا۔ اگست کی پہلی تاریخ کو ہی گھر میں گاؤں جانے کا پروگرام بننا شروع ہو گیا تھا۔ میاں عبدالرحیم نے ان کو اجازت دے دی تھی اور عبدالعزیز صاحب نے یوسف کے والد کی طرح عام مصروفیات کی وجہ سے معذوری ظاہر کر دی تھی اور بلقیس کو اجازت دے دی تھی کہ وہ یوسف اور اُس کی امی کے ساتھ جا سکتی ہے۔ یوسف بہت اچھی طرح کار چلانا سیکھ چکا تھا اور عبدالعزیز نے یوسف سے یہ بھی کہا تھا کہ

"اب تم ڈرائیور کے بغیر بھی کار اپنے گاؤں تک لے جاسکتے ہو" اور یوسف نے جواب دیا تھا۔ "چچا جان، کار اس موسم میں ہمارے گاؤں تک نہیں جاسکتی اِس لیے ہم گاڑی یا بس پر جائیں گے۔ سٹیشن یا لاریوں کے اڈے سے اُتر کر ہمیں دو میل تانگوں پر جانا پڑے گا۔"

تیرہ اگست کو وہ گاؤں جانے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ اور پندرہ اگست صبح کو انہوں نے بس پر روانہ ہونے کا پروگرام بنایا تھا لیکن چودہ اگست کو انہیں یہ خط آیا کہ ہم انشاء اللہ یہاں سے بائیس اگست کو روانہ ہوں گے اور جی بھر کر آپ کے علاقے کی سیر کریں گے، ہم اس گاڑی پر آئیں گے جو دن کے وقت آپ کے اسٹیشن پر پہنچتی ہے اور روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم آپ کو تار بھی دے دیں گے۔

قدسیہ نے اُسی وقت جواب لکھا۔ "پیاری بہن۔ ہم تو آپ کی خاطر چودہ کو وہاں جا رہے تھے۔ اب ہم پانچ چھ دن اور یہاں ٹھہر جائیں گے۔ بائیس اگست کو آپ کا انتظار کیا جائے گا۔ اُس دن اور اُس کے بعد بھی پٹھانکوٹ کی طرف آنے والی دونوں گاڑیاں باقاعدہ دیکھی جائیں گی۔"

اٹھارہ اگست کی صبح امینہ، اُس کی ماں اور چراغ بی بی اُن کے گھر آئیں اور امینہ کی ماں نے قدسیہ سے شکایت کی۔ "آپا جان۔ آپ نے ہمیں زہرہ کے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔ پرسوں شام اگر بھائی صاحب ہمارے گھر نہ آتے تو ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ زہرہ یہاں ہے۔ بہرحال آج دوپہر کا کھانا آپ کو ہمارے ہاں کھانا ہوگا اور ہم انتظام کر کے آئے ہیں۔"

قدسیہ نے کہا۔ "بہن اگر یوسف کے ابا تمہارے گھر پرسوں گئے تھے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کل دورے پر چلے گئے ہیں۔"

"جی، مجھے معلوم ہے۔ لیکن آج امینہ کے ابا بھی تو گھر پر نہیں ہیں۔ ہم نے

زہرہ کی دعوت کی ہے اِس لیے آپ کو آنا پڑے گا۔"

قدسیہ نے کہا۔ "دیکھو رشیدہ، رات مجھے نیند نہیں آئی اور اِس وقت بھی میری طبیعت خراب ہے۔ تم زہرہ اور باقی تمام بچوں کو ساتھ لے جاؤ اور مجھے گھر میں لیٹنے دو۔"

رشیدہ بولی۔ "نہیں وہاں جا کر آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"دیکھو رشیدہ ضد نہ کرو۔"

یوسف نے بہت کم اپنی ماں کو یہ کہتے سنا تھا کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ گھبرا کر بولا۔ "امی جان، میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"

"بیٹا! ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر سونے کے بعد میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ جاؤ تم بھی ان کے ساتھ دعوت میں چلے جاؤ لیکن جلدی واپس آجانا۔"

"نہیں امی جان۔ میں آپ کے پاس ٹھہروں گا اور جب آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ابھی کھانے میں کافی دیر ہے۔"

"نہیں بیٹا! نوکر یہاں موجود ہے اور تم ریشم بی بی کو کہو کہ میرے پاس آجائے۔"

رشیدہ بولی۔ "چلو بیٹا۔ ہم تمہیں واپس بھیج دیں گے اور باقی اطمینان سے آئیں گے۔ میں چراغ بی بی کو بھی تمہاری امی کی خدمت کے لیے بھیج دوں گی۔"

قدسیہ نے کہا۔ "رشیدہ میری فکر نہ کرو۔ ریشم بی بی ہماری پڑوسن ہے۔ چراغ بی بی سے کہو بائیں ہاتھ دیوار کے قریب جا کر آواز دے۔ وہ فوراً یہاں پہنچ جائے گی۔"

"میں بلاتا ہوں امی جان۔" یوسف یہ کہہ کر اُٹھا اور بائیں طرف دوسرے مکان کی چھت کے پردے کے اُوپر سے جھانکتے ہوئے آواز دی۔ "خالہ جی، خالہ جی۔"

ایک چوبیس پچیس سال کی عورت پردے کے اُوپر سے اِس طرف آگئی اور یوسف نے کہا "خالہ جان! آپ امّی جان کا خیال رکھیں مَیں ابھی آتا ہوں۔"

"خدا خیر کرے کیا ہوا آپا جی کو؟" ریشم بی بی نے جلدی سے نچلی چھت عبور کر کے بالائی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

قدسیہ نے کہا "ریشم بی بی تمہیں یوسف کی تسلّی کے لیے کچھ دیر میرے پاس بیٹھنا پڑے گا۔ ورنہ ہمارے یہ مہمان ناراض ہوجائیں گے۔"

رشیدہ نے کہا "ہاں بہن یہ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ہم ان کی دعوت کر بیٹھی تھیں اور آپا جی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔"

یوسف بادلِ ناخواستہ اُن کے ساتھ مکان سے نکل گیا اور قدسیہ بستر پر لیٹ گئی اور ریشم بی بی نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "آپا میں آپ کے ہاتھ پاؤں دبا دوں۔"

"نہیں بہن! مجھے پانی پلا دو اور نوکر سے کہو کہ وہ نیچے ہی کھانا تیار کردے۔"

قدسیہ کچھ دیر لیٹے لیٹے باتیں کرتی رہی اور پھر اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔

بالائی منزل کے دو کشادہ کمروں اور باورچی خانے کے سامنے خالی چھت کے دو حصّے تھے۔ وہ حصّہ جو ڈیوڑھی اور بیٹھک کے اُوپر تھا کوئی پانچ فٹ اُونچی دیوار نے باقی چھت سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس چھوٹے حصّے پر بیت الخلاء اور غسلخانہ تھا۔ بڑے حصّے میں کُھلا کشادہ جنگلا تھا۔ جس سے روشنی نچلے حصّے میں جاتی تھی۔

ریشم بی بی ایک خوش طبع عورت تھی اسے ہر وقت ہنستے ہنساتے دیکھا جاتا تھا۔ اگر مسئلہ قدسیہ کے پاؤں دبانے یا کسی اور کام کا ہوتا یا اگر وہ اُس کے ساتھ باتیں کرسکتی تو اُسے وقت کٹتا محسوس نہ ہوتا لیکن قدسیہ آنکھیں بند کیے

خاموش پڑی تھی اور اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُسے کوئی تکلیف ہے اِس لیے اُسے بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔

یوسف کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے ایک ہاتھ ماں کی پیشانی پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی نبض دیکھنے لگا۔ ماں نے آنکھیں کھولیں۔

"بیٹا، تم انہیں راستے میں چھوڑ کر واپس آگئے ہو؟"

"نہیں امّی جان۔ میں بے چین ضرور تھا لیکن انہوں نے مجھے روکنے کی بجائے ہمارا ابھی اور خالہ کا بھی کھانا موٹر میں رکھوا دیا تھا۔ نوکر اُوپر لا رہا ہے۔ آپ ہاتھ دھو کر تیار ہوجائیں۔"

ماں نے کہا "بیٹا کھانا دوسرے کمرے میں رکھواؤ اور تم وہیں بیٹھ کر کھالو۔ ریشم بی بی تم بھی اپنے میاں اور بچّوں کو بلا کر انہیں کھلا دو۔ میرے لیے ایک بالٹی یہاں رکھ دو اور غسل خانے سے باہر بھی پانی کا ایک لوٹا رکھوا دو۔"

یوسف نے پریشان ہو کر "اچھا" امی جان کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹا۔ تم جا کر کھانا کھاؤ اور ریشم بی بی کے بچوں کو بھی بلالو، وہ بھوکے ہوں گے۔ بھائی حسین علی جب گھر آئے تو نوکر سے کہنا کہ اُن کا کھانا وہیں پہنچا دے۔"

"انہیں مَیں بلا لیتا ہوں امی جان! لیکن آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے میں پہلے ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔"

"بیٹا! میری بات مانو تم کھانا شروع کرو گے تو شاید میں بھی تمہارے ساتھ آکر دو لقمے کھالوں۔ اِس وقت مجھے تلخی سی محسوس ہو رہی ہے اور جی بھی کچھ متلا رہا ہے۔ ریشم بی بی کہہ رہی تھی کہ ابھی لیموں کے شربت کے دو ٹھنڈے گلاس پینے سے میری طبیعت ٹھیک ہوجائے گی۔"

"لیکن مجھے ڈر ہے کہ پانی پیتے ہی مجھے قے آجائے گی۔"

"امّی جان کچھ نہیں ہوگا۔ مَیں ابھی حکیم صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ اُن سے پُوچھ کر صندل یا اُس سے کوئی اور اچھا شربت اور تازہ لیموں لے آتا ہوں۔"

"ہاں بیٹا جلدی کرو اور برف بھی لے آنا۔"

یوسف بھاگتا ہوا نیچے کی طرف گیا تھوڑی دیر بعد اُس نے واپس آکر حکیم صاحب کے تجویز کردہ شربت میں لیموں کا رس اور پانی ملا کر ایک بڑا جگ تیار کیا اور ایک گلاس بھر کر اپنی ماں کو پیش کر دیا۔ قدسیہ نے جلدی سے پینے کے بعد کہا۔ "بیٹا ایک گلاس اور بھر دو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر آگ سلگ رہی ہے۔" دوسرا گلاس پینے کے بعد اُس نے تکیہ پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا اب تم کھانا کھالو اور شربت کی بجائے خالی پانی کا ایک جگ برف ڈال کر تپائی پر رکھ دو۔ اگر میں سو جاؤں تو سمجھنا کہ میری تکلیف دُور ہو گئی ہے۔ لیکن اگر تم نے کھانا نہ کھایا تو مجھے چین نہیں آئے گا۔"

یوسف نے کہا۔ "آپ کچھ تو کھالیں۔"

"بیٹا اگر مَیں نے کچھ کھایا تو مجھے قے آجائے گی۔ جاؤ نا۔"

یوسف نے دوسرے کمرے میں جا کر ریشم بی بی اس کے چودہ سالہ سوتیلے بیٹے نظیر احمد اور اس کی چار سالہ بیٹی خدیجہ کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا پلاؤ کھایا اور جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "خالہ آپ اطمینان سے کھائیے مَیں امّی کے پاس جاتا ہوں۔"

ریشم بی بی نے کہا۔ "بیٹا! اگر وہ سو جائیں تو اُنھیں جگانے کی کوشش نہ کرنا۔"

باب - ۲۴

یوسف اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا تو قدسیہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ بستر کے ساتھ اُس کے سلیپر غائب پا کر اُسے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ دبے پاؤں چھت کے دوسرے حصّے کی طرف نکل گئی ہے۔ اُس نے باہر نکل کر جھانکا تو پانی سے بھرا ہُوا لوٹا بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ وہ بستر کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر ماں کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ گذر گئے اور وُہ اپنے دل میں اضطراب محسوس کرنے لگا۔ ریشم بی بی کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے مضطرب ہو کر کہا "خالہ جان مجھے معلوم نہیں امّی جان کس وقت دوسری چھت پر گئی تھیں لیکن جب میں کھانا کھا کر آیا تھا تو وہ یہاں نہیں تھیں۔ اب انھیں کافی دیر ہو گئی ہے۔ آپ اُس طرف جائیں اور پانی کا ایک اور لوٹا وہاں رکھوا دیں۔ شاید انہیں ضرورت ہو۔"

ریشم بی بی پانی کا ایک اور لوٹا بھر کر دوسری چھت کی طرف چلی گئی چند منٹ اور گذر گئے اور یوسف کے اضطراب کی شدّت میں اضافہ ہونے لگا۔

دیہاتی عورتیں طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے یا شام دھندلکے کے بعد اپنے گھروں سے باہر نکلتی تھیں اور جلد ہی واپس آجایا کرتی تھیں۔ قدسیہ ایک انتہائی صحت مند دیہاتی عورت تھی اور شہر میں آکر بھی اُس کی یہی حالت تھی کہ کسی نے اُس کو دن کے وقت بیت الخلاء کی طرف آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ ملیریا کے

موسم کے سوا اُسے کبھی بخار بھی نہیں ہوا تھا۔ جب یوسف کو اُس کا انتظار ناقابلِ برداشت محسوس ہونے لگا تو اُس نے چھت کے دوسرے حصّے کی دیوار کے قریب جا کر آواز دی

"خالہ! خالہ"

ریشم بی بی نے جواب دیا۔" بیٹا گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہاری امّی جان کو لے کر آتی ہوں۔"

یوسف چند قدم پیچھے ہٹ کر چوبارے کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔

ریشم بی بی قدسیہ کو سہارا دیتے چھت کے دوسرے حصّے سے نمودار ہوئی۔ قدسیہ کا چہرہ زرد تھا اور ریشم بی بی کے ساتھ چلتے ہوئے اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ یوسف نے بھاگ کر قدسیہ کو دوسری طرف سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان۔ آپ چھوڑ دیں۔ میں انھیں اندر لے جاتا ہوں۔"

"اچھا بیٹا۔ تم انہیں آرام سے لاؤ۔ یہ باہر سائے میں لیٹنا چاہتی ہیں۔ میں جلدی سے وہاں چارپائی ڈال دیتی ہوں۔"

اور پھر یوسف اُسے ایک کشادہ چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہہ رہا تھا"امی جان! کیا ہوا آپ کو؟ آپ نے مجھے ڈاکٹر بلانے سے کیوں منع کیا تھا۔؟"

"بیٹا" ماں نے تکیہ پر سر رکھتے ہوئے کہا" میں ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ریشم بی بی یہ بالٹی اِدھر رکھ دو اور مجھے ٹھنڈا پانی پلاتی رہو۔"

یوسف بولا" خالہ وہ جگ برف والے پانی سے بھرا ہے۔"

"میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں" یوسف جلدی سے اُٹھا اور بھاگتا ہُوا نیچے چلا گیا۔ کوئی بیس منٹ بعد یوسف محلّے کے مشہور ڈاکٹر کو لے کر پہنچ گیا۔ اُس نے دو دوائیاں اپنے تھیلے سے نکال کر دیں اور دو کاغذ پر لکھ کر بازار سے منگوانے کے لئے کہا۔

یوسف نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ لیتے ہوئے کہا" میں ابھی لے آتا ہوں لیکن امی جان

کی پیاس کا فوراً کوئی علاج کیجئے۔ یہ سخت پیاس کے باوجود پانی اِس لیے نہیں پیتیں کہ اُسی وقت قے نہ آجائے۔"

"بیٹا، تم نوکر سے کہو کہ پانی اُبال کر ٹھنڈا کرے۔ برف پانی میں نہ ڈالے۔ بلکہ پانی والا برتن برف کے اُوپر رکھ دے۔ جو دوائی میں منگوا رہا ہوں وہ پانی میں ڈال کر پلائی جائے گی اور پھر قے نہیں آئے گی۔ ان کے جسم سے بہت سا پانی ضائع ہو چکا ہے اِن کا علاج فوراً شروع ہو جانا چاہیے۔"

یوسف بولا۔"ڈاکٹر صاحب، جو اچھی سے اچھی دوائی ہے وہ مجھے لکھ دیں اور اس بات کی پروا نہ کریں کہ اُس کی قیمت کیا ہے؟"

"بیٹا جو اچھی دوائیاں تھیں وہ میں نے لکھ دی ہیں اور میں تمہاری گفتگو سے ان کی بیماری کے متعلق سمجھ گیا تھا۔ اِس لیے دوائیاں اپنے ساتھ بھی لے آیا تھا۔"

"آپ میرے آنے تک یہاں ٹھہریں گے نا؟"

"ہاں بیٹا۔ تم جاؤ۔"

یوسف نے نیچے اترتے ہوئے نوکر سے کہا" تم کسی بڑے دیگچے میں پانی اچھی طرح اُبالو اور پھر چھوٹے برتنوں میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دو۔ ایک دیگچی جلدی ٹھنڈی کرنے کے لیے نیچے سے بہت سادی برف بھی لے آؤ تاکہ ٹھنڈے پانی میں فوراً دوائی ڈال کر امی جان کو پلائی جا سکے۔"

چند منٹ بعد یوسف واپس آگیا۔ دیگچی کے پانی کو اُبال آیا تو ریشم بی بی نے اپنے خاوند حسین علی کو بھیج کر کوئی بیس سیر برف کی ایک سِل منگوا لی اور دیگچی کی بجائے تین کٹورے بھر کر اُس پر رکھ دیئے۔ ڈاکٹر نے پانی میں ایک دوائی ملا دی اور جب وُہ ذرا ٹھنڈا ہُوا تو ریشم بی بی نے ایک کٹورا اُٹھا کر اُس کے منہ کو لگاتے ہوئے کہا"بہن پی لیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اُنہوں نے اس میں جو دوائی ڈالی ہے اُس کی وجہ

سے آپ کو اب قے نہیں آئے گی۔"

قدسیہ نے جلد ہی کٹورا خالی کر دیا اور اس کے چہرے پر معمولی سی تازگی آ گئی۔ ڈاکٹر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "یوسف بیٹا! اب میں جاتا ہوں۔ آپ کو جب بھی ضرورت پڑے نوکر کو بھیج دیں۔ اپنی ماں کو تھوڑا تھوڑا پانی پلاتے رہیں۔ اگر انہیں نیند آجائے تو یہاں کوئی شور نہیں ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر چلا گیا تو قدسیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوسف ریشم بی بی کو خاموشی سے بیٹھنے کا اشارہ کر کے نیچے چلا گیا اور وضو کرنے کے بعد بیٹھک میں نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ زہرہ، امینہ اور چراغ بی بی جن کے پیچھے دوسرے بچے آ رہے تھے کار سے اُتر کر باتیں کرتی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں اور نچلے کمروں میں جھانکنے کے بعد اُوپر چلی گئیں۔ زہرہ اُن کے پُر تکلف اور امیرانہ ٹھاٹھ کا ذکر کرنے کے لیے بے چین تھی لیکن قدسیہ کی حالت دیکھ کر اُس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ قدسیہ نے آنکھیں کھولے بغیر۔ "ریشم بی بی مجھے پانی دو۔" کہا

ریشم بی بی نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور دوائی والے پانی کا ایک کٹورا پلا دیا۔

قدسیہ نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "میری بہن بہت سے پانی میں دوائی ڈال دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی مجھے آرام آجائے گا۔ پانی کا ایک دیگچہ اور اُبال لو۔ اس گھر میں سب کو اُبلا ہوا پانی پینا چاہیے۔"

یوسف دعائیں کرتا ہوا اُوپر آیا اور ماں کو باتیں کرتا دیکھ کر اسے اطمینان محسوس ہوا لیکن قدسیہ اچانک اس طرف جھک گئی جدھر بالٹی رکھی ہوئی تھی اور پھر اسے قے شروع ہو گئی۔ زہرہ نے اُس کے سر کو سہارا دے رکھا تھا جب اُسے لٹا دیا گیا تو اُس نے کہا۔ "ریشم بی بی مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اب میں مانگوں تو بھی مجھے پانی نہ دینا۔"

یوسف نے آگے بڑھ کر کہا۔ "امی جان، ڈاکٹر کہتا تھا کہ آپ کے جسم میں سے پانی کا ختم ہو جانا بہت خطرناک ہے۔ پتہ نہیں ابا جان ابھی تک کیوں نہیں آئے ورنہ میں انکل عبدالعزیز کو ساتھ لے کر جاتا اور کسی بڑے ڈاکٹر کو یہاں لے آتا۔"

زہرہ نے کہا۔ "ابا جان تو سیدھے ان کے گھر پہنچے تھے اور کھانا کھا کر وہیں سو گئے تھے۔"

امینہ نے کہا۔ "میں جاتی ہوں اور میاں صاحب اور اپنے ابا کو خبر دیتی ہوں۔ ابا جی یہاں کے ہر بڑے ڈاکٹر کو جانتے ہیں۔ چراغ بی بی جب تک خالہ جی ٹھیک نہیں ہوتیں تم یہیں رہو گی۔ یوسف صاحب مجھے اجازت ہے نا؟"

"جی میں آپ کا شکر گذار ہوں لیکن جلدی جائیے۔"

وہ تیزی سے زینے سے اُترنے لگی اور یوسف نے پہلی بار دیکھا کہ وُہ بہت نفیس کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

یوسف نے جنگلے کے قریب جا کر نوکر کو آواز دے کر کہا۔ "تم بھاگ کر حکیم صاحب کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ امی جان کو پانی پیتے ہی قے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر جو دوائیاں دے کر گیا وُہ بھی ان کے اندر نہیں ٹھہریں۔ کوئی ایسا عرق بھی دے دیجیے جس سے انہیں قے نہ آئے۔ میں دس روپے کا نوٹ نیچے پھینک رہا ہوں۔ یہ اُٹھاؤ اور بھاگ کر جاؤ۔"

قدسیہ نے لیٹے لیٹے ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا اور صغریٰ جو سہمی ہوئی ایوب کے ساتھ بستر کے قریب کھڑی تھی بولی۔

"بھائی جان! امی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

یوسف جلدی سے ماں کے سرہانے کے بائیں طرف بیٹھ گیا۔ قدسیہ نے اپنا ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور پھر اُس کا سر دونوں ہاتھوں

میں تھام کر اُس کی پیشانی چُومنے لگی۔

"میرے بیٹے" وہ نحیف آواز میں کہہ رہی تھی "میں تمہیں مغموم نہیں دیکھ سکتی۔"

"امی جان"، اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں مغموم نہیں ہوں۔ جب آپ ٹھیک ہو جائیں گی تو لوگوں کو دُور دُور تک میرے قہقہے سنائی دیں گے۔"

نوکر آیا اور اُس نے ایک تھیلا ریشم بی بی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"حکیم صاحب نے عرق کی چار بوتلیں دی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ان میں سے ایک چائے کی پیالی کے برابر نکال کر باری باری پلاتے جائیں اگر اس کے باوجود متلی آئے تو پیاز کا پانی نچوڑ کر ایک پیالی پلا دیں اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ انشاء اللہ بی بی جی کو پیاز کا پانی پینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ یہ عرق دیتے جائیں جب ختم ہو جائے تو اور منگوالیں۔"

یوسف نے کہا۔ "اچھا تم جاؤ۔"

زہرہ پیالی لے آئی اور اُس نے ایک بوتل سے عرق نکال کر ماں کو پلا دیا۔ چند منٹ بعد قدسیہ نے کہا۔ "مجھے اور دو۔" زہرہ نے دوسری بوتل سے عرق نکال کر پلا دیا اور قدسیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ بعد میاں عبدالرحیم اور عبدالکریم ایک ڈاکٹر کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور عورتیں ایک طرف ہٹ گئیں۔ ڈاکٹر کے سوالات کے جواب میں یوسف نے اپنی ماں کی بیماری کی ساری تفصیل بیان کر دی۔ ڈاکٹر نے مریضہ کا سرسری معائنہ کرنے کے بعد ہی میاں عبدالرحیم سے یہ کہہ دیا کہ "یہ ہیضے کا کیس ہے۔ آپ کو پانی پلاتے رہنا چاہیے۔ یہ جو عرق ہیں اس کے متعلق میں اطمینان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر انہیں باقاعدہ کشید کر کے بنایا گیا ہے تو ٹھیک ہیں ورنہ ان سے بھی پرہیز کرنا ہی بہتر ہوگا۔ میں ابھی باقی سب کو ٹیکے لگوانے کا انتظام کرتا ہوں۔ جو دوائیاں پہلے ڈاکٹر صاحب دے گئے

وہ ٹھیک ہیں۔ میں دو اور دوائیاں بھیج دوں گا۔ اگر انہیں نیند آجائے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ان کی بیماری دور ہو جائے گی۔ گھر میں سب اُبلا ہوا پانی پئیں اور مریضہ کے پانی میں دوائی کے ساتھ کچھ نمک بھی ڈال دیا کریں۔ جو دوائیاں میں بھیجوں گا وہ تین تین گھنٹے کے بعد دینی ہیں اور یہ جو آپ کے پاس پڑی ہوئی ہیں یہ بھی اسی طرح دینی ہیں جیسے ڈاکٹر صاحب آپ کو سمجھا گئے ہیں لیکن اگر یہ سو جائیں تو انہیں دوائی دینے کے لیے جگانے کی ضرورت نہیں۔ جب ٹیکہ لگانے والے آئیں تو آپ اپنے لیے ان لوگوں کو بھی ٹیکہ لگوا دیں جو یہاں آتے ہوتے ہیں۔ اِس موسم میں ہیضہ کے پھیل جانے کا بہت خطرہ ہوتا ہے۔"

یوسف نے ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! حکیم صاحب نے پیغام بھیجا ہے کہ پیاز کا پانی نکال کر پلا دیا جائے۔"

بوڑھے ڈاکٹر نے کہا۔ "بیٹا! اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ مفید ہو مگر مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو عبدالکریم نے کہا۔

"میاں صاحب! ہم ڈاکٹر صاحب کو پہنچانے کے بعد آپ کی دوائی لے آئیں گے، آپ یہیں بیٹھے رہیں۔"

یوسف انہیں نیچے چھوڑنے آیا تو اس نے عبدالکریم سے کہا۔ "میاں صاحب! میں امینہ کا بہت شکرگزار ہوں۔ انھوں نے ہمارے لیے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔"

امینہ بولی۔ "یوسف صاحب، یہ میرا فرض تھا۔"

عبدالکریم نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم ہسپتال سے ٹیکے لگوا کر ہی گھر جائیں؟"

"ہاں، جی ہاں! احتیاط کا مطلب تو یہی ہے۔"

عبدالکریم نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یوسف صاحب آپ ایسا کریں کہ اپنے نوکر کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ دوائی لے کر فوراً واپس آجائے کیونکہ اسکے بعد ہسپتال جا کر ہمیں شاید کچھ دیر لگ جائے۔"

یوسف بھاگتا ہوا اُوپر گیا۔ اُس نے نوکر سے کہا۔ "دیکھو میاں عبدالکریم صاحب، ڈاکٹر صاحب کو گھر پہنچا کر ٹیکے لگوانے کے لیے ہسپتال جائیں گے تم ان کے ساتھ جاؤ اور فوراً دوائی لے کر تانگے پر واپس آجاؤ۔"

نوکر نیچے پہنچ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا تھا کہ چراغ بی بی نے بھاگتے ہوئے کار کا دروازہ کھولا اور امینہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ عبدالکریم نے کھسیانا ہو کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چراغ بی بی! اچھا ہوا تم آگئیں ورنہ ہمیں ٹیکہ لگانے والوں کو گھر بلانا پڑتا۔"

کار اسٹارٹ ہوئی تو ایوب بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ "ٹھہرئیے۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ شاید صبح ہوتے ہی انکل عبدالعزیز اور چچی جان ہمارے گھر آجائیں۔ اِس لیے انھیں یہ اطلاع دینا ضروری ہے کہ ہمارے محلے میں ہیضہ پھیل رہا ہے اور امی جان بیمار ہیں۔"

"اچھا بیٹا!" عبدالکریم نے جواب دیا۔ "ہم ضرور ان کو اطلاع دے دیں گے۔"

انہوں نے تھوڑی دیر بعد ادویات کی ایک دوکان سے نوکر کو ادویات دے کر واپس بھیج دیا، اور کار ڈاکٹر کے مکان کی طرف چل پڑی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "بہت سمجھ دار لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ ہر انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

عبدالکریم بولا۔ "جناب، امینہ کا خیال تھا کہ اگر ہم فوراً اٹھ کر چل پڑے تو

یوسف ناراض ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک پڑھے لکھے آدمی کو ایسی بات پر ناراض نہیں ہونا چاہیے اور میری یہ بیٹی امینہ کسی کو ٹیکہ لگتے ہوئے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اب آپ اگر اسے یہ مشورہ دیں کہ ہیضے سے بچنے کے لیے ایک ہی وقت میں تمہیں دس ٹیکے لگوانے پڑیں گے تو اس کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔"

امینہ بولی۔ "اباجی! میں آپ کے ساتھ اِس لیے جا رہی ہوں کہ ٹیکہ لگانے والے کو یوسف صاحب کے گھر لے آؤں کیونکہ ان سب کو ٹیکہ لگوانا زیادہ ضروری ہے۔"

عبدالکریم نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے بیٹی! یہ زیادہ بہتر ہو گا کہ ہم ہسپتال سے کسی کمپونڈر یا ڈاکٹر کو اپنے گھر لے آئیں اور وہاں سے اپنے ڈرائیور کے ساتھ یوسف کے گھر بھیج دیں۔"

چراغ بی بی بولی "ہاں جی! بلاوجہ خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ میری نانی کہتی تھی کہ ایک دفعہ ہمارے گاؤں میں ہیضہ ——"

امینہ نے تلملا کر کہا۔ "خدا کے لیے چپ رہو، ورنہ موٹر کہیں ٹکرا جائے گی۔"

چراغ بی بی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکی۔

ڈاکٹر بولا "دیکھو بی بی کار چلانے والے کو کبھی پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ بیٹی امینہ تمہارا جذبہ قابلِ داد ہے لیکن تمہیں اپنا ٹیکہ لگوانے میں بھی ذرا تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں اپنے گھر پہنچتے ہی ہسپتال کے کسی ذمہ دار آدمی کو ٹیلی فون کروں گا اور انشاء اللہ وہ تمہیں ہسپتال پہنچتے ہی فارغ کر دے گا اور کوئی کمپونڈر تمہارے ساتھ جانے کے لیے بھی تیار ہو گا۔ اس کے بعد پہلے تم اپنے گھر پہنچو اور ٹیکہ لگانے والے کو اپنے ڈرائیور کے ساتھ یوسف کے گھر بھیج دو۔"

امینہ نے افسردہ لہجے میں کہا "اگر اباجی کی طرح آپ کا بھی یہی حکم ہے کہ میں یوسف صاحب

کی امّی کی خدمت نہ کروں تو میں آپ کے گھر سے ڈرائیور کو فون کروں گی کہ وہ تیار ہو کر کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا رہے تو پھر عبدالعزیز صاحب کو اطلاع دوں گی۔ ڈاکٹر صاحب آپ ہسپتال والوں کو یہ ضرور کہہ دیں کہ یوسف صاحب کے گھر اور پڑوس میں بہت سے لوگوں کو ٹیکے کی ضرورت پڑے گی۔"

"بیٹی تم فکر نہ کرو۔"

ایک گھنٹہ بعد کار عبدالکریم کی کوٹھی کے پھاٹک پر رُکی اور وہ اُتر پڑے۔ میاں عبدالکریم نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہسپتال کے ملازم کو دیتے ہوئے کہا "بھائی یہ لیجیے اور یوسف صاحب کے گھر جتنے آدمی ہوں انہیں ٹیکہ لگا دیجیے۔ ان کے پڑوسیوں کو بھی ٹیکہ لگانا ضروری ہے۔ شاید وہاں پولیس کے ایک بڑے افسر بھی آئیں۔"

"میاں صاحب یہ سب کام ان پیسوں کے بغیر بھی ہو جائے گا۔"

"نہیں بھائی یہ پیسے لینے ہی پڑیں گے اور میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔"

"اچھا میاں جی آپ کا شکریہ۔"

ڈرائیور نے کار سٹارٹ کر دی اور میاں عبدالکریم جسے تھکاوٹ کے ساتھ ہیضے کے ٹیکے کی تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ اچانک امینہ پر برس پڑا۔ "رشیدہ کو تم نے گھر آ کر یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ یوسف کی امی کو ہیضہ ہو گیا ہے۔ کتنے آرام سے یہ خبر سنائی تھی کہ یوسف کی امی کی طبیعت خراب ہے اور جب میں اُس کی تیمارداری کے لیے تیار ہو گیا تھا تو بھی تمہیں یہ خیال نہ آیا۔ ہیضہ ایک ایسا مرض ہے جو تیمارداروں کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔"

"اباجی آپ کیوں پریشان ہیں اب تو آپ نے ٹیکہ بھی لگوا لیا ہے۔"

عبدالکریم نے ذرا نرم ہو کر کہا "مجھے اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ تم اپنی ماں کو بھی ہمارے ساتھ گھسیٹ رہی تھی لیکن میں اس بات پر خوش ہوں کہ آج تم نے ٹیکہ لگواتے وقت چیخ نہیں ماری۔"

چراغ بی بی بولی! "میاں جی میں نے بھی چیخ نہیں ماری۔"

امینہ نے کہا "لیکن پسینہ تو آ گیا تھا تم کو اور آنکھیں بھی بند کر رکھی تھیں تم نے۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ موت کے خوف نے تمہارے اندر چیخیں مارنے کی طاقت نہیں چھوڑی تھی؟"

"مرنے سے کون نہیں ڈرتا۔ آپ کو تو وہاں سے بھاگنے کی اتنی جلدی تھی کہ مجھے بھول ہی گئی تھیں اور اب بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ٹیکے جو اُس بھینگے سے کمپونڈر نے ہم کو لگا دیتے ہیں۔ ہیضے کو روک لیں گے۔ ایک دن پہلے قدسیہ بیگم کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کبھی بیمار بھی ہو سکتی ہیں اور چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ اتنی کمزور ہو سکتی ہیں کہ کوئی پہچان بھی نہ سکے۔ خدا کی قسم مجھے تو اُن کی طرف دیکھ کر خوف آتا تھا۔"

امینہ نے کہا "دیکھو چراغ بی بی۔ کچھ پڑھنا شروع کر دو ورنہ تمہیں ہیضہ ہو گیا تو تمہیں دیکھنے والے ڈر کر چیخیں ماریں گے۔ اباجی دیکھیے اس کا رنگ بدل نہیں رہا؟"
رشیدہ نے باہر آ کر کہا "آپ اندر کیوں نہیں آتے۔ کیا حال ہے آپا قدسیہ کا؟"

"جی وہ ..." چراغ بی بی کوئی موزوں الفاظ سوچ رہی تھی لیکن امینہ نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "خدا کے لیے تم چپ رہو۔" اور چراغ بی بی غصے سے بل کھاتی ہوئی مکان کے ایک کونے میں غائب ہو گئی اور امینہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "امی جان اُن کی حالت اچھی نہیں آپ دعا کریں۔"

عبدالکریم بولا۔ ”اُس بیچاری کو ہیضہ ہو گیا ہے۔“

رشیدہ بولی۔ ”اللہ اُس پر فضل کرے، جاؤ بیٹی تم بھی نماز پڑھ کر دعا کرو۔“

اور امینہ زندگی میں پہلی بار انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ دعا مانگ رہی تھی۔

”یا اللہ یوسف کی امّی کو شفا دے۔ یا اللہ یوسف کو اس قدر پیار کرنے والی ماں کے سائے سے محروم نہ کیجیو۔“

یوسف نے مغرب کی نماز مسجد میں جا کر پڑھی، دیر تک انتہائی سوز و گداز کے ساتھ ماں کی صحت کے لیے دعا کرتا رہا۔ واپس گھر آتے ہوئے وہ قدم قدم پر رُک کر دعا مانگ رہا تھا۔ یا اللہ جب میں گھر پہنچوں تو مجھے زینے پر چڑھتے ہوئے امی جان کے قہقہے سنائی دیں اور انہیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہو کہ اُن کی بیماری کے متعلق جو میں سارا دن دیکھتا رہا وُہ سب ایک خواب تھا لیکن جب وہ ماں کے قریب پہنچا تو اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اُس کا دل بیٹھ گیا۔ اُس نے زہرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”انہیں پھر قے آئی ہے؟“

”ہاں بھائی۔ جو دوائی نوکر لے کر آیا ہے وہ بھی اِن کے اندر نہیں ٹھہری۔“

یوسف نے کہا۔ ”دوائی اندر نہ ٹھہرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بند کر دی جائیں، کم از کم اُبلا ہوا پانی انہیں تھوڑا تھوڑا ضرور پلاتے رہیں۔“

یوسف کے باپ نے کہا۔ ”بیٹا! حکیم صاحب ابھی دیکھ کر گئے ہیں اور انہوں نے یہ کہا تھا کہ پیاز کا پانی نکال کر پلانے سے قے بند ہو جاتی ہے۔ مَیں نے حسین علی کو کہہ دیا تھا اور وہ نیچے کونڈے میں پیاز کوٹ کر پانی نکال رہا ہے۔ تم دعا کرو یہ فائدہ مند ثابت ہو۔“

پھر انہوں نے آگے جھک کر قدسیہ سے پوچھا۔ ”قدسیہ یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تمہارا بستر اب اندر کر دیا جائے۔ رات کو شبنم کی نمی سے تمہاری طبیعت اور خراب

ہو جائے گی۔“

قدسیہ نے نحیف سی آواز میں کہا۔ ”ہاں۔ میرا بستر اندر ہی کر دو اور میرے اُوپر کمبل یا رضائی بھی ڈال دو مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے۔“

زہرہ نے جلدی سے ایک چارپائی پر صاف بستر بچھایا اور پھر یوسف کی مدد سے اسے سہارا دے کر اندر لٹا دیا اور اُس کے اُوپر کمبل ڈال دیا۔ ایوب اور صغریٰ نے گھر میں پڑے کھانے سے کچھ کھا لیا۔ حسین علی شیشے کے ایک جگ میں پیاز کا رس نکال کر لے آیا۔ جب زہرہ نے اُس میں سے ایک پیالی بھر کر قدسیہ کو پیش کی تو وُہ ہچکچائی اور پھر یکایک آنکھیں بند کر کے دو گھونٹ پی لیے اُس کا جی بُری طرح متلا رہا تھا۔

حسین علی نے کہا۔ ”میاں جی! حکیم صاحب یہ بھی کہتے تھے کہ اگر بیگم صاحبہ کو پیاز کے رس سے متلی آنے لگے تو انہیں الائچی کا عرق چمچے کے ساتھ آہستہ آہستہ شروع کر دیں۔ پھر ذرا طبیعت بحال ہو جائے تو یہ چند گھونٹ پیاز کا رس اور پی لیں اگر پانچ منٹ بھی وہ اندر ٹھہر گیا تو انہیں قے نہیں آئے گی۔“

جلدی سے الائچی کے عرق کی بوتل سے ایک چمچہ بھر کر سامنے کیا تو ماں نے لیٹے لیٹے منہ کھول دیا اور عرق حلق کے اندر اتارنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں پانچ منٹ اور گذر گئے تو یوسف نے قریب جا کر کہا۔ ”امی جان ایک اور پلا دوں؟“

ماں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ عشاء کی اذان کی آواز سنائی دی تو ماں نے کہا۔ ”بیٹا جاؤ نماز پڑھ لو۔“

”نماز میں کافی وقت ہے امی جان۔“ میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا ٹھیک ہو جائیں الائچی کا عرق اور دوں امی جان“۔ اُس نے ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”بیٹا! میرا خیال ہے کہ اب میں پیاز کا رس پی سکتی ہوں۔“

یوسف نے پیالی سے پیاز کے رس کا چمچ بھر کر آگے کیا اور قدسیہ نے

آنکھیں بند کرکے منہ کھول دیا۔ پیاز کا رس حلق سے اتارتے ہوئے وہ بُری طرح منہ بنا رہی تھی اور دیکھنے والے سب یہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں وہ قے نہ کر دے۔ پانچ منٹ گذر گئے تو یوسف نے کہا "ابا جی اللہ نے ہم میں سے کسی کی دُعا قبول کر لی ہے۔ میں نماز پڑھ آؤں اب چند منٹ تک آپ انھیں صرف الائچی کا عرق پلا دیں۔ اس کے بعد ہم پیاز کے رس کی مقدار آہستہ آہستہ بڑھاتے جائیں گے اور ڈاکٹر کی دوائی ملا کر اُبلا ہوا پانی پلانا بھی شروع کر دیں گے۔"

مسجد میں نماز ختم کرنے کے بعد یوسف دیر تک سربسجود ہو کر دعا کرتا رہا۔ جب وہ اُٹھا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ گھر کے قریب پہنچا تو سڑک پر عبدالعزیز کی موٹر کھڑی تھی۔ اُس نے ڈرائیور سے پُوچھا "یہ چچا جان تشریف لائے ہیں؟"

"جی ہاں بیگم صاحبہ بھی آئی ہوئی ہیں۔"

یوسف جلدی سے مکان میں داخل ہوا تو اُوپر سے عبدالعزیز کسی سے باتیں کرتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ یوسف ڈیوڑھی میں رُک کر انتظار کرنے لگا۔ عبدالعزیز نے یوسف پر نظر پڑتے ہی پیچھے مُڑ کر اُس کے باپ سے کہا "میاں صاحب آپ جا کر آرام کریں۔ یوسف صاحب آ گئے ہیں۔"

یوسف کے والد نے کہا۔ "اچھا جی۔ آپ کی تکلیف کا بہت شکریہ، یوسف جاؤ انھیں کار تک چھوڑ آؤ۔"

یوسف نے پوچھا "ابا جی! امی جان کو دوبارہ قے تو نہیں آئی۔"

"نہیں لیکن اُن کی طبیعت بہت متلا رہی ہے اور ان پر پھر یہ خوف سوار ہے کہ پانی پیتے ہی پھر انہیں قے دوبارہ شروع ہو جائے گی۔"

عبدالعزیز نے کہا "میاں جی! ڈرائیور مجھے پہنچا کر یہاں آجائے گا اور بلقیس یہیں

رہے گی۔ میں راستے میں آپ کے ڈاکٹر سے مِل کر جاؤں گا اور اگر انھوں نے مشورہ دیا تو میں کسی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی اُن کے ساتھ بھیج دوں گا۔ یوسف بیٹا تمھیں باہر جانے کی ضرورت نہیں تم اپنی امّی کے پاس رہو۔ میں موٹر واپس بھیج دوں گا اور وہ یہیں رہے گی۔ میری ضرورت پڑے تو ڈرائیور بھیج دینا میں فوراً آجاؤں گا۔

باب - ۲۵

عبدالعزیز خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ اُوپر سے زہرہ کی آواز آئی۔ "یوسف بھائی!"

وُہ تیزی سے زینے پر چڑھا اور بھاگتا ہوا ماں کے بستر کے قریب پہنچا تو بلقیس نے کہا "یوسف انھیں غش آگیا ہے۔ تم ان کا منہ کھولنے میں میری مدد کرو۔"

یوسف نے دیکھا تو اُس کے دانت مضبوطی سے ملے ہوئے تھے اور وہ بے ہوش تھی۔ اُس نے پہلے بھی اس حالت میں لوگوں کو دیکھا ہوا تھا۔ اُس نے باچھوں کے اندر دونوں ہاتھ ڈال کر منہ کھول دیا۔ بلقیس کی ہدایت کے مطابق زہرہ نے عرقِ گاؤزبان کا ایک چمچہ بھر کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔ قدسیہ نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور اُس نے کہا "میرا جسم سردی سے سُن ہو رہا ہے۔ میرے اوپر رضائی ڈال دو۔" پھر اس نے اچانک ایک طرف جُھک کر بالٹی میں قے کر دی۔

ریشم بی بی نے اُس پر رضائی ڈال دی اور وہ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ پھر اُس نے کہا "یوسف کے ابا آپ آرام کریں۔ بلقیس بہن آپ کچھ دیر میرے پاس بیٹھیں۔ باقی سب یہاں سے چلے جائیں۔ یوسف بیٹا! تم بھی جا کر لیٹ جاؤ۔ تمہیں پریشان دیکھ کر مجھے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔"

عبدالرحیم باہر نکل کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور یوسف بھی اُس کے پاس

آ بیٹھا۔ بلقیس کے سوا سب کمرے سے نکل گئے۔

"بلقیس"۔ اُس نے کہا۔ "اپنی کرسی ذرا آگے کر لو۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئیں ورنہ میں ایک حسرت اپنے ساتھ لے جاتی۔ میری بہن مجھے معلوم ہے کہ میرا وقت آچکا ہے۔ میں کبھی اس طرح بیمار نہیں ہوئی لیکن میں محسوس کیا کرتی تھی کہ ایک دن میرا یوسف اچانک میرے پیار سے محروم ہو جائے گا۔ ماں کو سب بچے پیارے ہوتے ہیں لیکن یوسف میرے لیے ہر بچے سے مختلف ہے۔ بہن جس دن آپ لوگوں سے پہلی ملاقات ہوئی تھی مجھے اطمینان محسوس ہوا تھا کہ اگر میں اچانک دنیا سے چلی جاؤں تو یہ وہ لوگ ہیں جو میرے بیٹے کو میری کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے اور فہمیدہ کو دیکھ کر تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کی تھیں۔ بہن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اپنے بیٹے کی دائمی رفاقت کے لیے جس بچی کا میں تصور کیا کرتی تھی وہ اچانک کہیں سے نکل کر میرے سامنے آگئی ہے۔ بہن کاش میں اتنی با اختیار ہوتی کہ میں اُسی وقت اپنے اور آپ کے خاندان کے تمام لوگوں کو جمع کر سکتی اور ان کے سامنے یہ اعلان کر سکتی کہ یہ میری بہو ہے۔ بہن مجھے یہ اطمینان تھا کہ یوسف کی پسند وہی ہو گی جو میری پسند ہو اور مجھے یہ یقین ہے کہ یوسف عمر بھر کسی لڑکی کا نام نہیں لے گا۔ لیکن یہ صرف خدا جانتا ہے کہ اپنے فیصلوں پر عمل کرنے میں وہ کس قدر با اختیار ہو گا۔ میری بہن! جب میں بھائی عبدالعزیز اور تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو میرے دل کو یہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ جب کوئی آزمائش کا وقت آئے گا تو میرا بیٹا یہ محسوس نہیں کرے گا کہ وُہ تنہا ہے۔"

بلقیس نے کہا "آپا آپ کس بات سے خائف ہیں۔ یہ اطمینان میں آپ کو دلا سکتی ہوں کہ فہمیدہ کے والدین کی طرف سے یوسف کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اُس کی ماں اور اُس کی نانی اگر اس وقت یہاں موجود ہوتیں تو میں اُن سے اعلان

کروادیتی کہ وہ آپ کے بیٹے کو بہت پہلے پسند کرچکی ہیں۔ بہن اللہ تمہیں صحت دے
بیں صفیہ کے گھر تمہارے ساتھ جاؤں اور پھر تم دیکھو گی کہ وہ کتنی خوشیاں مناتے ہیں۔"

قدسیہ نے کہا۔" بہن میں صرف آپ سے یہ اطمینان چاہتی ہوں کہ اگر یوسف کو کوئی مشکل پیش آجائے یا وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے تو کیا وہ لوگ چند برس اُس کا انتظار کرسکیں گے؟"

"ہاں۔ اور فہمیدہ کے بارے میں تو مَیں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ وہ ساری عمر یوسف کا انتظار کرسکے گی۔"

"بہن خدا تمہارا بھلا کرے۔ فہمیدہ کو صرف اتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا جب تک کہ یوسف خود مختار نہیں ہوجاتا۔" قدسیہ نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کرلیں۔

○

بلقیس کچھ دیر کرب کی حالت میں اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر وہ بولی

"بہن! یوسف جیسے بیٹے کی ماں کو کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو کس بات سے بے اطمینانی ہے؟"

"اب مجھے کوئی بے اطمینانی نہیں۔" قدسیہ نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

"آپ کو عبدالکریم کی لڑکی سے کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"بہن اُس سے نہیں لیکن اُس کی وجہ سے ایک پریشانی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ یوسف کے ابا کسی دن اُن لوگوں کی دولت سے اِتنے مرعوب نہ ہوجائیں کہ میرے بیٹے کے گلے میں رسّا ڈال کر اُن کے حوالے کرنے کی کوشش کریں۔ بہن میں یوسف کی ماں ہوں اور مجھ سے زیادہ اُسے کوئی نہیں جانتا۔ مجھے یقین ہے کہ جب اُس کی عزتِ نفس پر حملہ کیا جائے گا تو وہ ساری دنیا کے ساتھ لڑنے پر تیار ہوجائے گا۔ بلقیس میں اس بات پر بے حد خوش تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو تلاش کرلیا ہے لیکن مجھے اس بات

سے خوف آتا ہے کہ اگر میرے بدقسمت نے اُس کا ساتھ نہ دیا تو اُس کی زندگی کتنی تلخ ہوجائے گی لیکن میری بات کا بُرا نہ ماننا فہمیدہ کا نام سُن کر اُس کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھتا ہے اور فہمیدہ کے بغیر..." قدسیہ کی آواز بھرا گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے۔

بلقیس نے کہا۔" بہن اگر تمہیں اِس بات سے اطمینان ہوسکتا ہے تو مَیں اللہ کو حاضر ناظر سمجھ کر یہ وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ صورتِ حال خواہ کچھ ہو میری تمام ہمدردیاں یوسف اور فہمیدہ کے ساتھ ہوں گی۔"

"اچھا بہن مجھے پانی پلاؤ۔ اب جو پلاتی جاؤ گی مَیں پیتی جاؤں گی۔ اب مجھے ٹیکے کا خوف نہیں رہا۔ مجھے اِس بات کا بھی خوف نہیں رہا کہ میں اچانک اِس دنیا سے چلی جاؤں گی۔"

بلقیس نے آواز دی۔" یوسف اندر آؤ۔ انہیں وہ دوائیاں اور پھر چار دل عرق باری باری پلاتے جاؤ۔"

یوسف نے جلدی سے ایک پیالی بھر کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔" چچی جان مَیں باہر اِن کی آواز سُن کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ ٹھیک ہو رہی ہیں۔"

بلقیس نے عرق کی پیالی پلانے کے بعد کہا۔" بیٹا! یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے تھا۔ تمہارے متعلق باتیں کرتے ہوئے ان میں جان آجاتی ہے۔"

قدسیہ کچھ دیر آنکھیں بند کرکے پڑی رہی پھر اُس نے نحیف آواز میں کہا۔" یوسف۔"

"جی امّی جان۔"

ماں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ قدسیہ نے آہستہ آہستہ ہاتھ بلند کیا اور یوسف نے گردن نیچی کرکے اُس کا ہاتھ اپنے سر پر

رکھ لیا۔ قدسیہ کچھ دیر کمزور ہاتھ اُس کے سر پر پھیرتی رہی۔ پھر اُس نے دونوں
ہاتھوں سے اُس کا سر پکڑ کر اپنے سینے سے بھینچ دیا۔

"یوسف!" وُہ ڈوبتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "اللہ تمہاری حفاظت کرے۔
تم اپنے خاندان میں خوشیاں تقسیم کرنے کے لیے زندہ رہو اور وہ لوگ بھی تمہاری خوشیوں
میں شریک ہوں جو تم سے پیار کرتے ہیں۔ بیٹا! تم تھک گئے ہو گے۔ جاؤ سو جاؤ۔
مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

یوسف کے سر پہ ماں کی انگلیوں کی گردش اچانک تھم گئی اور وہ گھبراہٹ
کے عالم میں سر اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ قدسیہ کی آنکھیں بند تھیں۔ یوسف نے ایک
ہاتھ اس کی پیشانی پر اور دوسرا نبض پر رکھتے ہوئے بلقیس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چچی جان
امّی جان کا جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے نبض بھی بہت کمزور ہے۔"

بلقیس نے جلدی سے اپنی انگلی قدسیہ کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بیٹا انہیں غش آ گیا ہے۔ تم آرام سے اِن کا منہ کھولو مَیں پانی اور دوائی
ڈالتی ہوں۔ اِس مرتبہ ہمیں دوائی والا پانی زیادہ مقدار میں دینا پڑے گا۔"

یوسف نے اپنے دونوں انگوٹھوں سے زور دے کر منہ کھولا اور قدسیہ
نے معمولی جدوجہد کے بعد دوائی اُس کے بعد دو چمچ عرق اور ایک پیالی پانی حلق سے
اُتار لیا لیکن فوراً قے آ گئی۔

بلقیس نے آواز دی۔ زہرہ تولیہ لاؤ۔ جلدی کرو۔"

ریشم بی بی بھی اندر آ گئی اور یوسف نے کہا۔ "خالہ! آپ فوراً یہ بستر اور امّی
کے کپڑے بدل دیں۔ مَیں باہر جاتا ہوں۔"

دس منٹ بعد وہ اُس کا باپ اور باقی تیماردار بستر کے گرد کھڑے تھے۔
قدسیہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہی تھی پھر اُس نے

ایک لمبا سانس لیا اور کھلی آنکھوں کے اندر زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ بجھ
گئے۔ زہرہ رونے لگی۔ یوسف نے کہا۔ "زہرہ! اِس وقت کسی کی آواز گھر سے
باہر نہیں جانی چاہیے۔"

بلقیس نے سسکیاں لیتے ہوئے آگے بڑھ کر قدسیہ کی آنکھیں بند کر دیں۔
عبدالرحیم خاموشی سے آنسو بہا رہا تھا۔ ایوب دوسرے کمرے سے اُٹھ کر آیا اور
یوسف کے ساتھ لپٹ گیا۔ ریشم بی بی کھل کر رونا چاہتی تھی لیکن جب یوسف نے زہرہ
کو بھی اِس بات کی اجازت نہ دی تو وہ سسکیاں لیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔ یوسف
غور سے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رضائی اور کمبل اُتار کر اُس پر ایک سفید چادر
ڈال دی گئی تھی۔ اُس کے سُرخ و سفید چہرے پر جو زردی چھا گئی تھی وہ نیلاہٹ میں
تبدیل ہو چکی تھی۔ جو ہاتھ چادر سے باہر تھا اُس کی انگلیاں آہستہ آہستہ سکڑنے کی وجہ
سے متحرک معلوم ہوتی تھیں اور یوسف دیوانہ وار اُس کی نبض ٹٹولتے ہوئے اپنے
آپ کو یہ تسلی دے رہا تھا کہ وُہ زندہ ہے۔ "چچی جان"۔

اُس نے کہا۔ "دیکھئے! ان کی انگلیاں ہل رہی ہیں۔"

بلقیس نے کہا۔ "یوسف بیٹا! ہمت سے کام لو۔ اب جا کر نہا لو اور صبح
کی نماز کی تیاری کرو۔"

اچانک یوسف کو ایسا محسوس ہُوا کہ وہ اِس دنیا میں اپنی سب سے بڑی
جائے پناہ کو بھول گیا ہے۔ اُس نے نیچے جا کر غسل کے بعد کپڑے تبدیل کیے اور
جاء نماز لے کر اُوپر ماں کی میت کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دوسری چھت پر چڑھ
گیا۔ اذان ہوئی تو وُہ نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز کے اختتام پر وہ دیر تک سربسجود
پڑا رہا۔ "میرے اللہ! مجھے صبر اور حوصلہ دے۔ میرے اللہ! میری ماں کی وہ دعائیں
قبول فرما جو اُس نے آخری وقت تک میرے لیے کی ہیں۔ یا اللہ! قیامت کے دن

مجھے اِن کی روح کے سامنے شرمسار نہ کرنا۔ یا اللہ مجھے اپنی دنیا میں زندہ رہنے کے وہ سلیقے عطا کر کہ میری ماں کی روح مجھ سے خوش ہو۔ یا اللہ! میری امی، میرے دادا اور میرے چچا کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ یا اللہ! میرے والد اور میرے بہن اور بھائی کو صبر ہمت اور حوصلہ دے۔ آمین۔"

اور پھر جب اُس نے سر اٹھایا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ مشرق کے افق پر طلوع آفتاب کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ چھت پر کھڑا تھا مشرق کی طرف پھیلی ہوئی بدلیاں آہستہ آہستہ سرخ ہو رہی تھیں۔ آسمان پر وہی پرندے اُڑ رہے تھے جنھیں وہ ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ درختوں کا رنگ وہی تھا لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا کہ دنیا میں کوئی خلا پیدا ہو چکا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ زینے پر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا۔ عبدالعزیز اُوپر آ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر یوسف سے لپٹ گیا۔ یوسف نے چند سسکیاں لینے کے بعد کہا۔ "چچا جان آپ نے اور چچی جان نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "بیٹا اگر ہم دس گنا یا سو گنا زیادہ تکلیف اُٹھا کر تمھاری امی کی جان بچا سکتے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوتی۔ بہر حال اب تم نے حوصلے سے کام لینا ہے۔ قبر کے لیے آدمی بھیج دیئے گئے ہیں۔ مکان اور گلی کی صفائی کے لیے محکمہ صفائی کی ٹیم اور ہیضے کے ٹیکے لگانے کے لیے ڈاکٹر تھوڑی دیر تک یہاں پہنچ جائے گا۔ آپ سب کو ٹیکے لگوا دیں اور میں نے سُنا ہے کہ آپ کی مہمان کے بچّے کو بھی کوئی تکلیف ہے اس کے متعلق بھی ڈاکٹر سے پوچھ لیں اور یوسف صاحب خود بھی ٹیکہ لگوانا ہے آپ کو۔"

"چچا جان ہم سب ٹیکہ لگوا چکے ہیں۔ میاں عبدالکریم نے ہسپتال سے آدمی بھیج دیا تھا۔"

"اچھا میں تھوڑی دیر کے لیے جاتا ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹے تک آ جاؤں گا اور بلقیس بھی میرے ساتھ ہی جائے گی۔"

"لیکن چچا جان! ٹیکے کی آپ کو بھی ضرورت ہے۔"

"بیٹا تمھیں ہمارے متعلق اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ہیضے اور ٹائیفائیڈ کا ہر سال باقاعدہ ٹیکہ لگوایا کرتے ہیں اب احتیاطاً ایک اور لگوا لیں گے۔ میں تمھیں ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ میاں عبدالکریم کا نوکر صبح سویرے آپ کے گھر کا حال پوچھنے آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر تمھاری امی کی وفات کا سنتے ہی وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ آپ کا پُرانا واقف ہے۔"

"جی یہ وہی ہو گا جو گاؤں میں عبدالکریم کے ساتھ تھا اور جس نے ڈاکو ارجن سنگھ کو باندھنے کے لیے رسّوں کے علاوہ ایک پلنگ کی آدھی نواڑ خرچ کر دی تھی۔"

"ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے اور بیٹا تمھارے دل پر یہ بوجھ نہیں رہنا چاہیے کہ اب گاؤں جانے کے پروگرام کا کیا بنے گا۔ میں انہیں تار دے رہا ہوں کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر آپ گاؤں نہیں جا سکیں گے میں مقامی پولیس کو بھی فون کر دوں گا کہ انہیں اطلاع کر دی جائے اور مزید احتیاط کے لیے میں ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دوں گا کہ وہ آپ کے ریلوے اسٹیشن پر پہرہ دیتا رہے۔"

یوسف نے کہا۔ "جس آدمی کو آپ بھیجنا چاہتے ہیں اُس کے ساتھ میں عبدالکریم کا نوکر بھیج دیتا ہوں۔ وہ بہت قابل اعتماد ہے اور وہ یہ سُن کر بہت خوش ہو گا کہ مجھے انسپکٹر صاحب نے کسی ڈیوٹی کے قابل سمجھا ہے۔"

"یہ تو اور زیادہ اچھی بات ہو گی۔"

بیگم قدسیہ کے جنازے میں شریک ہونے والے لوگ گیارہ بجے کے قریب قبرستان سے واپس آچکے تھے۔ یوسف قبر کے قریب کھڑا تھا۔ جنازہ گھر سے نکلتے وقت اُس نے جنوب مغرب کی طرف جو بادل دیکھے تھے وُہ اب پورے آسمان پر چھا رہے تھے۔ جنوب سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ پھر بادل گرجا اور بارش ہونے لگی۔ یوسف وہاں سے آہستہ آہستہ چل دیا۔ وہ گھر جا رہا تھا لیکن اُسے پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ تیز بارش میں اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد اُس کے عین سامنے آکر ایک کار نے ہارن دیا۔ اُس نے چونک کر دیکھا تو عبدالعزیز کار چلا رہا تھا اور ڈرائیور پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ عبدالعزیز نے کچھ کہے بغیر دروازہ کھول دیا اور یوسف اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کار سے اُتر کر وہ مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو عبدالعزیز نے کہا۔ "بیٹا تمہیں اتنی دیر بارش میں پیدل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہیضے کے ٹیکے کے بعد تو ویسے بھی بخار ہو جاتا ہے تم جلدی سے کپڑے پہن لو اور نوکر سے کہو کہ میرا اور تمہارا کھانا بیٹھک میں لے آئے۔"

یوسف کپڑے بدل کر آیا اور کھانے کی میز پر عبدالعزیز کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "چچا جی! میری ماموں زاد کے بچّے کی طبیعت کافی خراب تھی لیکن چند بار پیاز کا رس پلانے سے کافی فرق پڑا ہے۔"

نوکر نے کھانا سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "میاں صاحب کھانا آپ بہت زیادہ لے آئے ہیں۔ ہم نے پڑوسیوں میں کافی بانٹا ہے اِس کے باوجود نصف سے زیادہ بچا ہوا ہے۔"

عبدالعزیز نے بے پروائی سے کہا۔ "بھئی جو بچ گیا ہے وہ بھی فوراً بانٹ دو۔"

یوسف نے پُوچھا۔ "چچا جی! آپ نے دھرم سالہ اطلاع بھیج دی ہے؟"

"ہاں بیٹا اور مجھے امید ہے کہ آج شام بھائی ناصرالدین پولیس اسٹیشن سے مجھے ٹیلی فون کریں گے۔ ایس۔ آئی کو میں نے بہت تاکید کی ہے شاید صفیہ اور بچّے بھی بات کرنے کے لیے اُس کے ساتھ آجائیں۔"

"چچا جی۔ میری طرف سے آپ اُن سب کو یہی کہیں کہ مجھے اُن کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

عبدالکریم کا نوکر فضل دین جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوُا اور کچھ فاصلے پر رُک گیا۔

یوسف نے اُٹھ کر کہا "آؤ فضل دین۔"

فضل دین آگے بڑھ کر سسکیاں لیتا ہوُا اُس سے لپٹ گیا۔ "یوسف صاحب! مَیں یہیں تھا لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ ماں جی کی حالت اتنی خراب ہے وہ سب یہی کہتے تھے کہ صبح سب کو ٹیکہ لگوانا ضروری ہے۔"

یوسف نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بھئی کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وُہ اتنی جلدی دُنیا سے رُخصت ہو جائیں گی اور پھر ایسے حالات میں ٹیکہ لگوانا تو بہت ضروری تھا۔ انہوں نے اچھا کیا تمہیں گلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"جی ایسی زندگی کا کیا فائدہ کہ ماں جی کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔"

"بیٹھ جاؤ فضل دین کھانا کھاؤ۔ زندگی کا یہ فائدہ ہے کہ تم مرنے والوں کے لیے دعائیں کر سکتے ہو۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "بھئی کھاؤ۔ تم خاموش کیوں بیٹھ گئے۔"

"جی مجھے بھوک نہیں۔"

یوسف نے کہا۔ "فضل دین بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تم اگر اپنی بھوک کے لیے نہیں تو ہماری خوشی کے لیے تھوڑا سا کھا لو۔"

یوسف نے ایک پلیٹ میں سالن اور چاول ڈال کر اُس کے سامنے کر دیا،
لیکن اُس نے کھانا شروع کرنے کی بجائے کہا "جی انہوں نے مجھے یہ پیغام دے کر
بھیجا تھا کہ رات کا کھانا اُن کے گھر سے آئے گا۔ وُہ خود اِس لیے نہیں آسکے کہ
ٹیکے کی وجہ سے انہیں بخار ہو گیا تھا۔"

یوسف نے کہا "بھئی فضل دین تم جلدی اُن کو واپس جاکر کہو کہ کھانا تو گھر
میں اتنا وافر پڑا ہے کہ آج ضرورت نہیں پڑے گی۔ اِس لیے کل دیکھا جائے گا۔ یہ
بھی اچھا ہُوا کہ انہوں نے ٹیکے لگوا لیے ورنہ بخار کی شدّت یہ ظاہر کرتی ہے کہ انہیں
بیماری کا خطرہ تھا۔"

فضل دین نے کہا۔ "یوسف صاحب اگر آپ اجازت دیں تو میاں صاحب
سے کل کے کھانے کا پوچھ لوں۔"

"ہاں وہ اندر کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ زیادہ باتیں نہ کرنا اُن کی طبیعت ٹھیک
نہیں۔"

باقی دن تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ گلی کے پاس پڑوسی نے
اُن کی سہولت کے لیے اپنے کشادہ مکان کی نچلی منزل خالی کروا دی تھی اور مہمانوں کو بٹھانے
کے لیے آس پاس سے کرسیاں بھی جمع کر کے وہاں رکھوا دی تھیں۔ عبدالعزیز نے
اُٹھ کر کہا۔ "یوسف تم اُوپر جاکر سو جاؤ، تمہارے لیے چند گھنٹے آرام کرنا بہت ضروری
ہے۔ میں تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے موجود رہوں گا۔ خواتین کا مسئلہ
آپ کی پڑوسن ریشم بی بی اور بلقیس سنبھال لیں گی۔"

"چچا جان آپ کو بھی تو آرام کی ضرورت ہے۔ میری مدد کے لیے حسین علی
موجود ہو گا۔"

حسین علی نے کہا۔ "جناب مہمانوں کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اِس محلّے کے

لوگ ایک برادری کی طرح رہتے ہیں۔ یوسف صاحب اگر شور میں آپ کو نیند نہ آئے
تو آپ میرے گھر جاکر لیٹ جائیں۔"

یوسف نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں جی میرا خیال ہے کہ مجھے بستر پر لیٹتے ہی
نیند آجائے گی۔"

یوسف اُوپر جاکر ایک چارپائی پر گر پڑا اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا
تھا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو باہر آفتاب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اُس نے
جلدی سے وضو کیا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ نماز کے بعد عبدالعزیز اُس کے ساتھ
مسجد سے باہر نکلا اور اُس نے کہا "بیٹا یہ تمہاری زندگی کا ایک بہت بڑا امتحان تھا۔
لیکن جب میں تمہیں نماز پڑھتا دیکھتا ہوں تو مجھے یہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ تم صبر
اور حوصلہ عطا کرنے والے کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلانا جانتے ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا
تھا کہ دعا مانگتے وقت تمہارے چہرے پر عزم و یقین کی روشنی آجاتی ہے۔"

یوسف نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "اس دُنیا
میں خدا کے عاجز بندوں کا سرمایہ یہی تو ہے چچا جان۔"

"اچھا تم اپنی چچی کو اندر سے بھیج دو اُس کے پاس جب بھی وقت ہوا کرے
گا وہ یہاں آجایا کرے گی۔"

"بہت اچھا چچا جان جب کانگڑہ میں آپ کی ٹیلی فون پر بات ہو تو انہیں
کہیے کہ ہم سب ٹھیک ہیں۔"

"ہاں بیٹا۔ وہاں تو ابھی تھوڑی دیر بعد شاید بات ہو جائے ورنہ صبح ہو جائے
گی۔ ویسے ایک دو دن تک ہمارے ہاں بھی ٹیلی فون لگ جائے گا۔"

○

رات کے وقت یوسف اپنے باپ کے قریب چوبارے کی چھت پر

لیٹا ہوا تھا۔

"اباجی! آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے نا؟" اُس نے کہا۔

"ہاں بیٹا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اب تو بخار وغیرہ معلوم نہیں ہوتا۔"

"اباجی! وہ ٹیکے کا اثر تھا۔ صبح تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ دو چار روز تک آپ سب کو ٹائیفائڈ کے ٹیکے بھی لگوا دیئے جائیں۔"

باپ نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا بیٹا۔ اب سو جاؤ۔"

یوسف دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ تارے اُسی طرح چمک رہے تھے۔ کہکشاں میں اَن گنت جھرمٹ اُسی طرح نظر آتے تھے جنہیں وہ اپنی ماں کے پاس لیٹ کر دیکھا کرتا تھا۔ وُہ سوچ رہا تھا کتنی ماؤں نے کتنے بچوں کو ان تاروں کی چھاؤں میں لوریاں دی ہوں گی۔ کتنے بچوں نے ماں کی گود سے اچھل کر چاند اور تاروں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔ موت ہماری زندگی کی کتنی اٹل حقیقت ہے اور ہم ہیں کہ اس حقیقت کو آخر وقت تک جھٹلاتے رہتے ہیں۔ یا اللہ مجھے اپنی قدرت کی حقیقتوں کو سمجھنے کا شعور اور انہیں تسلیم کرنے کی عقل عطا کر۔ یا اللہ مجھے سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے سیدھے راستے پر چلا۔ یا اللہ مجھے اپنا فرماں بردار بندہ بننے کی توفیق عطا فرما۔ یا اللہ وہ نیک دعائیں قبول فرما، جو میری ماں ہمیشہ میرے لیے کیا کرتی تھی۔ یا اللہ میرا دامن اتنی نیکیوں سے بھر دے کہ قیامت کے دن امی جان مجھے دیکھیں تو انہیں تسکین محسوس ہو۔ وہ دُعا کرتے کرتے سو گیا اور پھر وہ خواب کی حالت میں اپنی ماں کی انگلی تھامے سرسبز کھیتوں میں دَوڑ رہا تھا۔

○

عبدالعزیز مقامی تھانے دار کی وساطت سے یوسف کے گاؤں قدسیہ کی وفات کی اطلاع بھجوا چکا تھا۔ اس لیے دوسرے روز صبح ہوتے ہی اس کے چچا، چچیاں اور دوسرے

رشتے دار پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ نو بجے کے قریب عبدالکریم کے نوکر ریڑھے پر کھانے کی دیگیں لے کر پہنچ گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی بال بچوں سمیت پہنچ گیا۔ عبدالکریم نے فاتحہ خوانی کے بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میاں جی! مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر کے مشورے سے میں نے گھر جانے سے پہلے ہیضے کا ٹیکہ لگوا لیا تھا۔ مجھے اتنا شدید بخار ہوا کہ میں اگلے روز شام تک بستر سے نہ اٹھ سکا اور یہ پچھتاوا مجھے عمر بھر رہے گا کہ میں جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔"

میاں عبدالرحیم نے بے پروائی سے کہا۔ "بھائی صاحب جب کسی بیماری کا خطرہ ہو تو ہر آدمی کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ اُسے پھیلنے سے روکا جائے۔"

"امینہ کا بھی بُرا حال تھا۔ اُس کی ماں صبح آنے کے لیے تیار ہوئی تھی لیکن اچانک ٹیکہ لگانے والا ہمارے گھر پہنچ گیا اور اُس نے رشیدہ کے علاوہ میرے سب نوکروں اور پڑوسیوں کو بھی ٹیکے لگا دیئے۔

میاں جی آپ کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی مجھے یہ محلہ سنسان محسوس ہونے لگا تھا۔"

"ہاں بھئی مجھے بھی اس گھر میں اب وحشت محسوس ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ چھٹی لے کر گاؤں چلا جاؤں۔"

"میاں صاحب! اگر آپ کہیں تو ہم بھی گاؤں جائیں گے۔"

باب - ۲۶

کھانا کھانے کے بعد چند مہمانوں کے سوا باقی رخصت ہو چکے تھے - امینہ اور اُس کی ماں یوسف کی چچی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی - امینہ کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت رو چکی ہے - چراغ بی بی بھی حُزن و ملال کی تصویر بنی بیٹھی تھی - دوسرے کمرے میں عبدالکریم، عبدالرحیم سے کہہ رہا تھا: "میاں جی ! اب ہمیں اجازت دیجئے آپ کے ہاں مہمان بہت آئیں گے اور بچّوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی آپ کو تکلیف ہوگی - اِس لیے ہم چراغ بی بی کو یہیں چھوڑ جائیں گے "

"لیکن میں تو اب گاؤں جانے کی سوچ رہا تھا "

"میاں صاحب چراغ بی بی کی وہاں بھی آپ کو ضرورت ہوگی - جو کام ایک ماں کرتی ہے وہ سنبھالنا آسان نہیں اور میری تو یہ کوشش ہوگی کہ امینہ اور اُس کی ماں بھی زیادہ وقت آپ کے ہاں گذارہ کریں یا آپ کے بال بچّوں کو اپنے گھر لے جایا کریں - گاؤں جاکر ان کی کوشش ہی یہی ہوگی کہ وہ زیادہ وقت آپ کے ہاں گذارا کریں "

"اچھا آپ کی بڑی بڑی مہربانی - لیکن یہاں کام بہت زیادہ ہوگا - چراغ بی بی تنگ تو نہیں آجائے گی "

"بھائی جی ! میری بیوی کہا کرتی ہے کہ چراغ بی بی لوہے کی بنی ہوئی ہے -

اُس کے سامنے جتنا زیادہ کام ہو اُتنا زیادہ وُہ خوش رہتی ہے "

یوسف نے کہا: "ابا جی ! چچی جان کے ہوتے ہوئے ہمیں چراغ بی بی کو تکلیف نہیں دینی چاہیے - کل اسے بخار تھا اور شاید اب بھی اس کی طبیعت اچھی نہیں "

عبدالکریم نے بلند آواز میں کہا: " امینہ ! امینہ چراغ بی بی کو اِدھر بھیج دو "

چراغ بی بی جھجکتی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی -

"کیوں چراغ بی بی تمہاری طبیعت کیسی ہے ؟"

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں "

" چند دن میاں عبدالرحیم صاحب کے گھر کا انتظام سنبھالنے میں تمہیں تکلیف تو نہیں ہوگی "؟

"کیسی تکلیف جی "

"تم یہ تو نہیں سمجھو گی کہ تم سے نوکروں جیسے کام لیے جارہے ہیں "

"جناب میں نے ان کا گاؤں بھی دیکھا ہے اور ان کا گھر بھی دیکھا ہے اور یہ وُہ لوگ ہیں جن کے کمروں میں جھاڑو دینے پر بھی میں فخر کروں گی "

عبدالکریم نے میاں عبدالرحیم سے مخاطب ہو کر کہا: "ہم نے اِسے یہاں رہنے اور کام کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ اِس کی اپنی خواہش تھی - اچھا ہم چلتے ہیں - دیکھو چراغ بی بی میاں صاحب تمہیں یہ نہیں بتائیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا - تمہیں اپنی عقل سے کام لینا ہوگا "

جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو امینہ نے پہلی بار ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا یوسف صاحب ! میں بڑی دیر سے کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس الفاظ نہیں ہیں صرف آنسو ہیں اور میں اِس بات سے بھی ڈرتی ہوں کہ آپ رونے والوں کو

پسند نہیں کرتے۔"

یوسف نے جواب دیا: "امینہ میں ان لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتا ہوں جو مشکل یا آزمائش کے وقت صرف اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا کر آنسو بہاتے ہیں۔ میں ہر اس انسان کو پسند کرتا ہوں جو دوسروں کے لیے نیک جذبات رکھتا ہے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔"

— ○ —

امینہ آنسو پونچھتی ہوئی اپنے والدین کے ساتھ موٹر میں سوار ہوگئی۔ تھوڑی دُور جا کر اُس نے کہا۔ "ابا جی میں حیران ہوں کہ آپ کو ایک نئی مصیبت ان کے گلے میں ڈالنے کا کیسے خیال آیا؟"

"بیٹی کون سی مصیبت؟" عبدالکریم نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ابا جی! آپ چراغ بی بی کو مصیبت نہیں سمجھتے۔"

عبدالکریم بولا! "بیٹی تم بلاوجہ اس غریب سے نفرت کرتی ہو۔ ان دنوں وہ غریب بہت پریشان ہے جب سے اس کا خاوند فوج میں بھرتی ہو کر گیا ہے اُس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس بیچاری کا دل بہل جائے گا۔"

امینہ نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ "ابا جی وہ بے چاری نہیں ہے۔ اگر اس کا خاوند بے وقوف ہے اور اس نے جان بوجھ کر کوئی اطلاع نہیں بھیجی یا لاپتہ ہو گیا ہے تو اس کی سزا یوسف صاحب کو نہیں ملنی چاہیے۔"

عبدالکریم نے کہا "بیٹی تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔ میں نے یوسف کے سامنے بات کی تھی اور وہ ناراض نہیں تھا۔"

"ابا جی اُس نے کہا تو تھا کہ چراغ بی بی کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں اور اگر وُہ پوری طرح ناراض نہیں تھا تو ہو جائے گا۔ بہت جلد ہو جائے گا۔"

"بیٹی اگر وہ ہو جائے تو وہ واپس آجائے گی تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں اُسے کہہ دوں گا کہ تم اگر کسی وقت یوسف کو غصے میں آتا دیکھو تو فوراً واپس آجاؤ۔"

"ابا جی وہ بیوقوف کبھی یہ نہیں سمجھے گی کہ یوسف صاحب کو کسی بات پر غصہ آرہا ہے یا نہیں۔ آپ کو اُسے واپس بلانے کی کوئی اور ترکیب سوچنی پڑے گی۔"

رشیدہ بولی "میاں جی! بیٹی امینہ ٹھیک کہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یوسف ایک بہادر آدمی ہے اور ایک بہادر آدمی کو ایک بے بس عورت پر غصہ نہیں آئے گا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے یوسف ہم سب سے نفرت کرنے لگے۔"

عبدالکریم بولا "لیکن تم تو ہمیشہ اُس کی تعریف کیا کرتی ہو۔"

"جی میں تو اس کی دلجوئی کے لیے تعریف کیا کرتی تھی۔"

امینہ بولی! "ابا جی یہ غلطی مجھ سے کبھی نہیں ہوئی میں اُسے ایک مصیبت سمجھتی ہوں لیکن اس بات پر خوش نہیں ہوں کہ آپ نے اُسے دوسروں کے گلے میں ڈال دیا ہے۔"

"کیسی مصیبت بیٹی؟ میں اس کے باپ کو کہوں گا کہ وہ کسی دن جا کر اس کو لے آئے۔"

"ابا جی کسی دن کیوں، اس کے باپ کو ابھی بلا کر کیوں نہیں کہتے کہ وہ اسے یوسف کے گاؤں جانے سے روک دے۔"

"بیٹی اگر میں نے اب کچھ کہا تو بڑی بدمزگی ہوگی۔ ہمیں کچھ دن صبر کرنا پڑے گا۔"

— ○ —

منظور احمد چھٹیوں میں سرگودھا کے قریب اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔یوسف نے ماں کے کفن دفن سے فارغ ہوکر سرگودھا کے ایک ہم جماعت کو تار دیا تھا کہ وہ منظور کو اس کے گاؤں میں اطلاع بھیج دے۔چنانچہ منظور اگلی صبح لاہور پہنچ چکا تھا اور اس نے خط وکتابت کا کام سنبھال لیا تھا۔چار دن بعد وہ گاؤں جانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ سندھ سے یوسف کو احمد خان کا تار آگیا کہ وہ اگلی صبح لاہور پہنچیں گے۔چنانچہ یہ پروگرام دو دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔اگلی صبح گاڑی پہنچی تو احمد خان کے استقبال کے لیے یوسف اور منظور کھڑے تھے۔احمد خان نے گاڑی سے اُترتے ہی یوسف کو پیار سے گلے لگایا اور کہا بھائی میں نے بڑی دیر سے تمہارے گاؤں کا پروگرام بنایا تھا۔

پچھلے سال میں اپنے بیٹے کو ڈیرہ دون پبلک سکول داخل کروانے جا رہا تھا اور میں نے تمہیں کالج اور گاؤں دونوں جگہ خط لکھے تھے کہ اگر تم لاہور سے میرے ساتھ سفر میں شامل ہو جاؤ تو ہم دونوں جان محمد کو داخل کروانے کے بعد مسوری کی سیر کریں گے لیکن کوئی جواب نہ آیا۔پھر جب میں واپس گھر پہنچا تو گاؤں سے تمہارے چچا کا خط ملا کہ یوسف کے والد کی تبدیلی لاہور ہوگئی ہے اور وہ سب لاہور چلے گئے ہیں۔میں کسی دن اچانک تمہیں یہاں تلاش کرنے کا پروگرام بنایا کرتا تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ ہماری ملاقات ان حالات میں ہوگی۔اللہ تمہیں صبر وہمت دے۔اب میں پہلے تمہارے گھر جا کر فاتحہ پڑھوں گا۔پھر ماں جی کی قبر پر جاؤں گا۔اس کے بعد تمہیں اگر کوئی مصروفیت نہ ہوئی تو ہم نیڈوز ہوٹل آجائیں گے اور شام تک باتیں کریں گے۔رات کی گاڑی میں میں واپس چلا جاؤں گا اور یہ وعدہ لے کر جاؤں گا کہ آئندہ جب تمہیں چھٹیاں ملیں گی تم میرے پاس آیا کرو گے۔"

"تمہارے ابا جی کیسے ہیں؟"

"جی وہ بالکل ٹھیک ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

آپ کو اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔آپ کا سامان ہوٹل میں رکھوا کر ہم آپ کو گھر لے جائیں گے۔وہاں فاتحہ خوانی کے بعد آپ کو قبرستان بھی لے جائیں گے۔اس کے بعد آپ کا کھانا ہمارے گھر ہوگا۔"

"احمد خان نے جواب دیا بھائی مجھے منظور ہے۔"

اتوار کے دن عبدالعزیز اور بلقیس سے مشورہ کرنے کے بعد میاں عبدالرحیم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کل یہاں سے بس پر روانہ ہو جائیں گے۔عبدالعزیز اور بلقیس مصر تھے کہ آپ ہماری کار لے جائیں لیکن یوسف نے کہا "چچا جان آپ جانتے ہیں کہ آپ کی کار ہمیں شہر میں کسی جگہ چھوڑنی پڑے گی اور اس کی حفاظت ایک مسئلہ بن جائے گی۔پکی سڑک پر سے اُتر کر ہم تانگوں پر جائیں تو بھی ہمیں کچھ راستہ پیدل چلنا پڑے گا۔جب آپ ہمارے گاؤں آئیں تو میں آپ کے لیے گھر تک راستہ درست کرا دوں گا۔"

عبدالعزیز نے رخصت کرتے ہوئے کہا "اچھا بیٹا انشاءاللہ کل ہم تمہیں بس کے اڈے پر رخصت کریں گے۔"

یوسف نے کہا "چچا جان آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔"

"بیٹا اگر تکلیف ہوتی تو ہم کبھی نہ آتے۔"

"انشاءاللہ ہم عین وقت پر پہنچ جائیں گے۔"

اگر مجھے کوئی کام پڑ گیا تو بلقیس ضرور آئے گی۔

یوسف نے علی بخش کو تاکید کی کہ تم ہماری غیر حاضری میں ہماری ڈاک منظور احمد کے سپرد کر دیا کرنا۔ان کے پڑوسی حسین علی اور ریشم بی بی نے یہ ذمہ لیا تھا کہ اگر کوئی مہمان آپ کی غیر حاضری کے دوران آیا تو اُس کی خاطر تواضع کی جائے گی اور یہ سمجھا دیا جائے گا کہ آپ

کا گاؤں جانا ایک مجبوری تھی۔

اگلے دن وہ آٹھ بجے کے قریب بس پر بیٹھے ہوئے تھے اور ڈرائیور ہارن دے رہا تھا۔ اچانک بلقیس کی کار نمودار ہوئی اور عین بس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر بس ڈرائیور سے کچھ کہا اور پھر یوسف سے مخاطب ہو کر کہا! یوسف صاحب انسپکٹر صاحب نہیں آسکے انھیں کوئی کام تھا لیکن بیگم صاحبہ آئی ہیں۔

آپ ان سے بات کر لیں یوسف بس سے اترا اور آگے بڑھ کر بلقیس کو سلام کرنے کے بعد بولا کہ چچی جان خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیریت ہیں۔ میں بہت پریشان تھا چچا جان بالکل ٹھیک ہیں نا! بیٹا وہ ٹھیک ہیں کوئی ضروری کام انھیں پڑ گیا تھا میں اسی لیے بھاگی آئی ہوں کہ ٹیلی فون پر رات کو پیغام آگیا تھا اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ منگل کے روز دھرم سالہ سے روانہ ہوں گے اور اسی روز گاڑی تمہارے گاؤں کے اسٹیشن سے گزرے گی۔ تمہیں صبح مجھے یہ بتانے کا اچانک اِس لیے خیال آیا کہ شاید ایک مختصر سی ملاقات میں تم ان سے دعائیں لینا غنیمت سمجھو۔ یوسف نے آبدیدہ ہو کر کہا شکریہ چچی جان مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔

بلقیس نے کہا بیٹا افسوس اس بات کا ہے کہ ان کے پاس ٹیلی فون نہیں ہے ورنہ میں صفیہ، فہمیدہ اور نسرین سے بہت باتیں کرتی۔

بہت اچھا چچی جان میں منگل اور اس کے بعد ہر روز اُدھر سے آنے والی گاڑی دیکھا کروں گا۔ بلقیس مسکرائی "بیٹا اگر وہ منگل کو نہ آئے تو جمعرات کو آجائیں گے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ تم اسٹیشن پر ان کا انتظار کر رہے ہو"۔



چوتھے روز سہ پہر کے وقت یوسف ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ کارخانے کا گھڑیال جو دور دور سے دکھائی دیتا تھا۔ سوا تین بجا رہا تھا۔ ساڑھے

تین کے قریب شمال کی طرف سگنل ڈاؤن ہوا تو چند منٹ بعد دور سے گاڑی کی سیٹی سنائی دی۔ پھر انجن دھواں اڑاتا ہوا بل کھاتی ہوئی ریلوے لائن کے کناروں پر گھنے درختوں کی اوٹ سے نمودار ہوا اور تھوڑی دیر میں گاڑی اسٹیشن پر آرکی۔ یوسف نے اس اسٹیشن پر سینکڑوں بار گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ لیکن آج وہ پہلی بار اپنے دل میں ایک دھڑکن سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ انٹر کلاس کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ نسرین جو کھڑکی کے باہر جھانک رہی تھی چلانے لگی۔ بھائی جان! بھائی جان! ہم ادھر ہیں۔ امی جان، آپا فہمیدہ" نسرین فقرہ پورا کرنے کی بجائے سواریوں کو راستے سے ہٹاتی ہوئی گاڑی سے اتری اور یوسف کا ہاتھ پکڑ کر چلانے لگی۔

"امی جان، فہمیدہ، نانی جان، ابا جی باہر دیکھئے یہ بھائی جان یوسف ہیں۔ میں نے آپ کو دور سے پہچان لیا تھا۔ بھائی جان۔ وہ سب اندر ہیں۔ اندر دیکھئے امی اور فہمیدہ آپ کو دیکھ رہی ہیں اور ابا جان اور نانی جان بھی اندر ہیں۔ بھائی جان آپ کو معلوم تھا کہ ہم اس گاڑی پر آرہے ہیں۔ شاید آپ کو خواب آیا یا میری دعا قبول ہو گئی ہے" یوسف کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہو رہے تھے۔

صفیہ نے نسرین کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا بیٹا یوسف یہ اتفاق ہے یا کہیں سے تمہیں اطلاع مل گئی تھی۔ جب ہم لاہور سے روانہ ہو رہے تھے تو چچی بلقیس اچانک پہنچ گئی تھیں اور انھوں نے آپ کا پروگرام بتا دیا تھا۔

نسرین بولی "دیکھا آپا جان چچی بلقیس کتنی اچھی ہیں"۔

"صفیہ نے پوچھا بیٹا گاڑی یہاں کتنی دیر ٹھہرے گی"۔

"خالہ جان گاڑی دس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے گی لیکن میں ماں جی کی دعائیں لینے کے لیے میرے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا"۔

صفیہ نے کہا بیٹا یہ تو ہم سب کے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ یہاں سے گزرتے

ہوئے میرا دل بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ ہمارا ارادہ صبح کی گاڑی پر آنے کا تھا لیکن ہمیں گھر سے نکلنے میں دیر ہو گئی۔ مجھے گاڑی نہ ملنے کا افسوس تھا لیکن اب اللہ کا شکر کرتی ہوں کہ تم مل گئے۔

نسرین بولی "امی جان آپ بلاوجہ ناراض ہو رہی تھیں کہ میں نے اٹھنے میں دیر کر دی۔ اگر میں وقت پر تیار ہو جاتی تو بھائی جان کیسے ملتے؟"

یوسف مسکرایا "شہزادی صاحبہ میں نے صبح کی گاڑی بھی دیکھی تھی اور اگر آپ کل آتیں تو بھی میں دونوں گاڑیاں دیکھتا۔"

صفیہ نے پوچھا "بیٹا کل کیوں دیکھتے دونوں گاڑیاں؟"

"خالہ جان میں سوچ سکتا تھا کہ کوئی وجہ ہو گئی ہو گی اور آپ رک گئے ہوں گے۔"

فہمیدہ نے شرماتے ہوئے پوچھا "اور اگر ہم کل بھی نہ آتے تو؟"

"جی اس صورت میں میرے لیے غیر معمولی بات ہو جاتی اور میں یہاں تیسرے دن گاڑیاں دیکھنے کی بجائے سیدھا کانگڑہ پہنچتا" اور وہاں سے پولیس اسٹیشن جا کر آپ کا پتہ کرتا۔"

"بھائی جان آپ واقعی کانگڑہ پہنچتے"۔ نسرین نے پوچھا۔

"میں ضرور پہنچتا۔"

نسرین ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔ "امی جان کیا ہم دو دن کانگڑہ میں نہیں رک سکتے تھے۔"

ایک وجیہہ آدمی جس کی عمر چالیس برس سے اوپر معلوم ہوتی تھی۔ گاڑی سے اترا اور اس نے بے تکلفی سے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یوسف صاحب، میرا نام نصیر الدین ہے"۔

فہمیدہ بولی "یہ میرے اباجی ہیں"۔

نصیر الدین کا رنگ سرخ و سپید تھا اس کے سر اور چھوٹی چھوٹی داڑھی کے بالوں کی رنگت بھوری تھی اور بڑی بڑی چمکدار آنکھوں میں جوانی کی سی دلکشی تھی۔ یوسف اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے فہمیدہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اگر آپ نہ بتاتیں تو بھی میں غلطی نہ کرتا کہ یہ آپ کے اباجان ہیں۔"

نصیر الدین بولا "بھئی یوسف صاحب اب تو میں آپ کی تصویر بھی دیکھ چکا لیکن اس سے پہلے نسرین تمہارے متعلق اتنی باتیں کر چکی تھی کہ کسی جگہ تمہارے ملنے کی توقع ہوتی تو شاید میں بھی تمہیں پہلی نظر میں پہچان لیتا۔"

فہمیدہ نے کہا "امی جان گاڑی پر چلیں نانی جان اس طرف آ کر کھڑکی سے دیکھ رہی ہیں سخت غصے کے عالم میں ہیں۔"

یوسف جلدی سے گاڑی پر چڑھا اور اس نے بیگم فریدہ احمد کے قریب جا کر "ماں جی! السلام علیکم" کہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ فریدہ نے جلدی سے اٹھ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے اور بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا میں دوسری طرف بیٹھی تمہارے گاؤں کی سمت دیکھ رہی تھی اور یہ معلوم نہیں تھا کہ تم پلیٹ فارم پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہو۔"

نسرین نے آگے بڑھ کر کہا "نانی جان! بھائی جان نے سب سے پہلے آپ کو سلام کرنا تھا، اب میں آپ کو ایک اچھی خبر سناتی ہوں کہ بھائی آپ سے باتیں کرنے اور آپ کی دعائیں لینے کے لیے کچھ دیر اور ہمارے ساتھ سفر کریں گے اور کسی اگلے اسٹیشن سے واپس آ جائیں گے۔"

صفیہ نے کہا "امی جان اگلے اسٹیشن کا مطلب یہ نہیں کہ یہ یہاں سے دوسرے یا تیسرے اسٹیشن پر اتر جائیں گے بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ کم از کم امرتسر تک تو ہمارا ساتھ دیں گے اور وہاں بھی ہمیں باتیں کرنے کا کافی وقت مل جائے گا۔"

فریدہ احمد نے کہا "بیٹی یہ فیصلہ مَیں کروں گی کہ یوسف کہاں اُترے گا اگر یہ امرتسر تک ہمارا ساتھ دے سکتا ہے تو جالندھر تک ہمارا ساتھ کیوں نہیں دے سکتا؟ بیٹا یوسف تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر تھوڑی باتوں سے میری تسلی نہ ہو اور تمہیں ایک دن گھر سے غیر حاضر رہنا پڑے تو وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں ماں جی مَیں گھر میں یہ کہہ آیا تھا کہ مَیں ایک بزرگ سے دعا کروانے جا رہا ہوں اور ممکن ہے کہ وہ مجھے فوراً واپس آنے کی اجازت نہ دیں۔ ماں جی جب آپ ہمارے گاؤں کی طرف دیکھ رہی تھیں تو آپ نے چند قدم دُور شیشم کے پاس ایک آدمی کو گھوڑے کی باگ تھامے نہیں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تو تھا مَیں نے۔"

"نسرین، فہمیدہ خالہ جان اب آپ سب دیکھ لیں وہ میرا خاص آدمی ہے جس کے متعلق آپ پڑھ چکی ہیں۔"

نسرین، فہمیدہ اور ان کی ماں دوسری طرف کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگیں۔

نسرین نے پوچھا "بھائی جان وہ کون ہے؟"

یوسف نے کہا "میرا خیال ہے کہ فہمیدہ نے اسے پہچان لیا ہو گا۔"

فہمیدہ نے مڑ کر دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد منہ پھیر کر بولی "اگر آپ کی تحریر میں اس آدمی کا ذکر ہے تو اسے بلّو ہونا چاہیے صرف اتنا فرق ہے کہ لباس سے یہ بھیل معلوم نہیں ہوتا۔"

یوسف نے کہا "اب ہر بات میں ہماری پسند اس کی پسند بنتی جا رہی ہے۔"

نسرین نے پوچھا "بھائی جان، اب جنگلی پتّے کھلانے چھوڑ دیے ہیں اس نے؟"

"ہاں لیکن کچھوے اسے اب بھی بہت پسند ہیں۔"

بھیل کے ذکر سے نصیر الدین کو بھی کچھ دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ دوسری طرف

جا کر دیکھنے لگا۔

فریدہ احمد نے اُٹھتے ہُوئے کہا "ارے مَیں بھی دیکھ لوں وُہ کیا بلا ہے؟"

"ماں جی آپ آرام سے بیٹھی رہیں اب گاڑی چلنے والی ہے۔" یہ کہتے ہوئے یوسف نے دوسری طرف پہنچ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور پائیدان پر پاؤں رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ بلند کر کے اشارہ کیا۔ بلّو نے اپنے ہاتھ سے اس کے اشارے کا جواب دیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اس کے پہیے حرکت میں آئے وُہ کچھ دیر اپنا ہاتھ ہوا میں لہراتا رہا اور پھر اس نے گھوڑے کی باگ پھیر لی اور اسے سرپٹ چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ مکئی کے کھیتوں میں غائب ہو چکا تھا۔

بیگم فریدہ احمد نے آواز دی "بیٹا اب میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ اور جب تک میں تمام باتیں نہ پوچھ لوں تمہیں کسی طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہیں۔"

نسرین نے کہا "نانی جان اگر اجازت ہو تو ہم سب آپ کے پاس آ جائیں۔" تھوڑی دیر میں وہ سب آمنے سامنے دو سیٹوں پر بیٹھ گئے باقی ڈبہ خالی تھا۔

صفیہ نے کہا "امی جان، اگر اجازت ہو تو میں پہلے ایک ضروری بات پوچھ لوں؟"

"ہاں بیٹی پوچھو تمہیں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بیٹا یوسف، مَیں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ گھر میں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں تھی؟"

"خالہ جی! امی جان نے مجھے یہ معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ پریشانی کیا ہوتی ہے۔ ایسی تمام باتیں انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھیں اور اب مجھے معمولی بات بھی پریشان کر دیتی ہے۔"

یوسف کی آنکھیں نم ناک ہو رہی تھیں اور ان سب کے چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

فہمیدہ نے مغموم آواز میں کہا "آج آپ نے دونوں گاڑیاں دیکھیں فرض کیجئے اگر ہم اس گاڑی پر بھی نہ آتے تو پھر آپ کیا سوچتے؟"

"پھر میں بار بار یہ دعائیں کرتا کہ آپ سب بخیریت ہوں کیونکہ امی جان کی وفات سے میں نے یہ سبق لیا ہے کہ پریشانیاں جس قدر زیادہ ہوں اسی قدر زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

نسرین نے پوچھا "بھائی جان" بلو گھر جا کر کیا بتائے گا؟"

"وہ میرے چچا کو یہ بتائے گا کہ میں نے شہر میں گھومنے اور اپنے دوستوں سے ملنے کے بعد اچانک کسی بزرگ کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے علاوہ جو کہنے والی باتیں ہیں وہ میں بڑی چچی کو سمجھا آیا ہوں۔"

صفیہ نے کہا "بیٹا گھر میں اگر کوئی پریشانی تھی تو تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔"

"کوئی خاص پریشانی نہیں تھی لیکن اب تک پوری طرح سمجھ نہیں سکا اور بعض باتوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کل عبدالکریم والے بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ ٹھہرے تو اپنے گھر میں ہیں لیکن تیور یہ بتا رہے ہیں کہ ان کا زیادہ وقت ہمارے ہی گھر میں گزرا کرے گا اور وہاں وہ مہمانداری کے فرائض بھی سنبھال لیں گے اور تو اور وہ چراغ بی بی بھی ان کے ساتھ آئی ہے۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا "خدا اسے غارت کرے، وہ کیا لینے آئی ہے۔"

"ماں جی، اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں سب عورتیں اس سے ہمدردی کرتی ہیں۔ پہلے تو اس پر اس وجہ سے ترس آتا تھا کہ اس کا خاوند جو شادی سے تھوڑی دیر بعد فوج میں بھرتی ہو کر کہیں چلا گیا تھا، لاپتہ ہو چکا ہے۔ اب اس افواہ کی تصدیق ہو چکی ہے وہ جنگ میں کام آ چکا ہے اور ان حالات میں میں بھی اسے قابلِ رحم سمجھتا ہوں لیکن جب ان میں سے کوئی میرے ساتھ بات کرے تو مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امی جان کی وفات کے بعد بعض لوگوں کے متعلق میرے دل میں اچانک سختی آ گئی ہے۔ ماں جی، میرے لیے یہ بھی دعا کریں کہ میرے دل میں کوئی غلط قسم

کی سختی پیدا نہ ہو جائے۔"

بیگم فریدہ احمد نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹا، میں ہر سانس کے ساتھ تمہارے لیے دعا کرتی ہوں اور مجھے یہ یقین ہے کہ جو بات بھی تمہارے دل میں پیدا ہو گی وہ غلط نہیں ہو گی۔"

نصیر الدین نے کہا "یوسف صاحب، آپ اطمینان کے ساتھ ہمارے ساتھ سفر کریں کہ جس جگہ ہم رہتے ہیں وہ آپ کا دوسرا گھر ہے۔" یہ عجیب بات ہے کہ جس دن میں نے نسرین اور ماں جی سے کوئٹہ سے واپس آ کر آپ کا ذکر سنا تھا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ جب میں آپ کو دیکھوں گا تو آپ اجنبی نظر نہیں آئیں گے۔"

نصیر الدین نے کہا "یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں کے ساتھ ہم زندگیاں گزار دیتے ہیں اور مانوس نہیں ہوتے اور بعضوں کے ساتھ ایک مختصر سی ملاقات میں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم انہیں برسوں سے جانتے ہیں۔"

"ارے بھائی مجھے بھی اپنے بیٹے سے بات کرنے دو گے یا نہیں"۔ فریدہ احمد نے بیزار سی ہو کر کہا۔

"امی جان! بیٹا اس وقت تک آپ کی باتیں سنتا رہے گا جب تک آپ تھک نہیں جائیں گی۔"

یوسف نے بٹالہ اسٹیشن پر اتر کر وضو کیا تو نسرین نے گاڑی سے اتر کر اسے جانماز پیش کر دیا۔ یوسف ایک طرف ہٹ کر جانماز بچھا رہا تھا کہ نصیر الدین گاڑی سے اتر کر وضو کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یوسف نے نماز ختم کی تو وہ جانماز پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچھ دیر یوسف کے ساتھ پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا، گاڑی نے سیٹی بجائی تو وہ گاڑی پر سوار ہو گئے۔

جالندھر تک سفر کا وقت ایک خواب کی طرح گزر گیا۔ جالندھر اسٹیشن سے

اُتر کر انہوں نے دو تانگے لیے۔ ایک پر خواتین سوار ہو گئیں اور دوسرے پر یوسف اور
نصیر الدین بیٹھنے لگے تو نسرین صفیہ سے یہ کہہ کر اُتر گئی "امی جان مجھے بھائی جان سے ایک
ضروری بات کہنی یاد آئی ہے" پھر وہ بھاگ کر دوسرے تانگے کے قریب پہنچی اور
یوسف سے مخاطب ہو کر بولی "بھائی جان، آپ آگے بیٹھ جائیں تاکہ آپ یہاں سے ہمارے
گھر تک کا سارا راستہ اچھی طرح دیکھ سکیں"۔

نصیر الدین نے کہا "میری بیٹی ٹھیک کہتی ہے"۔

یوسف آگے چلا گیا اور نسرین اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ تمام راستہ وہ شور مچاتی
رہی۔ "بھائی جان، اب ہم فلاں موڑ پر ہیں........ یہ وہ بنگلہ ہے..... یہ سڑک ہمارے
سکول کی طرف جاتی ہے، آگے سے ہم اپنے گھر کی طرف مڑیں گے"۔ لیکن یوسف کو کچھ پتہ
نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اُس کی حالت ایک ایسے مسافر کی سی تھی جسے منزل پر پہنچ کر نیند
نے آلیا ہو۔ مکان میں داخل ہوتے وقت بھی اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ دروازہ کس سمت کھلتا
ہے؟ نوکروں کو مہمانوں کے آنے کی اطلاع تھی اور انھوں نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ صفیہ
نے مکان میں داخل ہوتے ہی نوکر سے پوچھا "دہرہ دون سے کوئی اطلاع آئی ہے"؟

"جی ہاں، مینجر صاحب کا فون آیا تھا کہ ___ حمیرا بی بی اور ذکیہ بی بی کل پہنچیں گے"

یوسف نے عشاء کی نماز ادا کی اور کھانا کھاتے ہی بالائی منزل کے ایک کمرے
میں جا کر سو گیا۔

ایک مدت کے بعد وہ خواب میں دل کش پہاڑ اور حسین وادیاں دیکھ رہا تھا، جب
اس کی آنکھ کھلی تو روشندان سے دھوپ اندر آ رہی تھی، اُس نے کروٹ بدلی تو
اُسے نسرین دروازے سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دی: "نسرین" اُس
نے آواز دی۔

"بھائی جان" اس نے شکایت کے لہجے میں کہا "آپ بہت سوتے ہیں۔ نانی جان
نماز کے وقت آپ کو دیکھ گئی تھیں اور پھر انہوں نے سختی سے یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی آپ
کو جگانے کے لیے اُوپر نہ جائے۔ ناشتہ کرنے سے پہلے اور ناشتہ ختم کرنے کے بعد وہ
خود دو دفعہ اُوپر آئی تھیں اور پھر انہوں نے بڑی سختی سے امی جان کو یہ حکم دیا تھا کہ جب
تک آپ خود نہ اُٹھیں آپ کو کوئی نہ جگائے۔ اِس کے بعد وہ سو گئی تھیں اور ہم باری
باری آپ کو دیکھتے رہے۔ دو دفعہ امی جان، تین بار آپا فہمیدہ اور چوتھی مرتبہ میں واپس
جا رہی تھی"۔

فہمیدہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی "السلام علیکم" کہا۔ یوسف نے اُٹھ کر
بیٹھتے ہوئے کہا "میں نے آپ کو یقیناً پریشان کیا ہوگا لیکن مجھے مدت کے بعد نیند آئی
ہے۔ میں کئی وادیاں، کئی پہاڑ، کئی دریا دیکھ چکا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ ایک طویل
سفر میں امی جان میرے ساتھ تھیں"۔

فہمیدہ نے کہا "بھوک کا نیند کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ نسرین اپنے بھائی کو
غسل خانہ دکھا دو۔ میں امی جان کو یہ خوشخبری دیتی ہوں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں"۔

تھوڑی دیر بعد یوسف نیچے ایک کمرے میں صفیہ، نسرین اور فہمیدہ کے ساتھ
بیٹھا ہوا تھا۔ فہمیدہ نے ناشتہ لا کر ایک میز پر رکھ دیا۔

فریدہ احمد نے کہا "بیٹا.. جلدی سے ناشتہ کر لو"۔

یوسف میز کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نسرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"نانی جان، آپ بھی بیٹھ جائیں نا بھائی جان کے ساتھ"۔

"چڑیل، مجھے دوبارہ ناشتہ کراؤ گی"۔

"نانی جان آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ مہمان کو تنہا نہیں بٹھاتے"۔

"بے وقوف میرا مہمان نہیں ہے، بیٹا ہے، اگر تم اسے مہمان سمجھتی ہو تو تھوڑی

دیر فہمیدہ کی طرح صبر کر لیا ہوتا۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ فاقہ کرے گی۔"

نانی جان میں نے آپا کو کہا ہے لیکن اُسے امی کے اشارے اور آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔"

"کیوں فہمیدہ... کسی نے تمہیں منع کیا تھا؟"

"نہیں نانی جان۔"

فہمیدہ جھجکتی ہوئی یوسف کے سامنے بیٹھ گئی، اور پھر ناشتے کے دوران وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔

یوسف نے صفیہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "خالہ جان، آج مجھ سے اپنے دادا جان اور امی جان کی حکم عدولی ہوئی ہے۔ میں نے کسی حالت میں بھی نماز قضا نہیں ہونے دی تھی، لیکن آج میں بہت سویا، آپ مجھے جگا دیتیں تو اچھا ہوتا۔"

"بیٹا... یہ نیند بلا وجہ نہیں تھی۔ ایسی حالت میں قضا بھی تو پڑھی جا سکتی ہے بیٹا اب تم کچھ دیر آرام کر لو۔

اتنی دیر میں نسرین کے ابّو دہرہ دون سے آنے والے بچوں کو اسٹیشن سے لیکر پہنچ جائیں گے پھر کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد بھی بہت سی باتیں کرنی پڑیں گی"

فریدہ احمد نے کہا "ہاں بیٹا، وہ تو پہروں تمہارے ساتھ باتیں کرنا چاہیں گے۔ وہ اسٹیشن پر تمہارے آنے کی اطلاع سن کر بے چین ہو جائیں گے۔"

صفیہ نے کہا "امّی جان، صبح جب نسرین کو یہ پتہ چلا کہ اس کے ابّا جان شہر میں اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی سیدھے اسٹیشن پر چلے جائیں گے تو وہ بڑی پریشان تھی کہ اُسے پہلے کیوں نہیں بتایا اور وُہ ان کے ساتھ کیوں نہ جا سکی۔"

"بیٹی نسرین تو گھر آتے ہی پڑوسیوں کو اپنے بہادر بھائی کی خبر دینا چاہتی تھی۔ اگر میں اسے منع نہ کرتی تو آج ہمارے گھر میلہ لگا ہوتا۔"

"نانی جان، میلہ تو اب بھی لگے گا جو لوگ ہمیں جانتے ہیں وہ ہمارے بھائی کو دیکھے بغیر یہاں سے کیسے جانے دیں گے۔"

صفیہ نے کہا "بیٹی، تمہارے بھائی جان کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"امی جان! میں نے کب انہیں بے آرام کیا ہے میں تو صرف نانی جان سے چند جھڑکیاں سننا چاہتی تھی۔ دیکھا نہیں آپ نے کہ آپا فہمیدہ بھی تو یہی کہتی ہیں کہ نانی جان کو جب غصہ آتا ہے تو بڑی پیاری لگتی ہیں۔"

فہمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا "بے وقوف لڑکی، نانی جان ہنستی ہوئی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔"

فریدہ نے کہا "تم دونوں بہت شریر ہو۔"

یوسف نے کہا "ہاں جی، پیار نہیں آتا آپ کو ان کی شرارتوں پر۔"

"بہت پیار آتا ہے بیٹا، اسی لیے تو انہیں دیکھ کر اپنے گھر کی تمام ذمہ داریاں بھول جاتی ہوں۔"



دوپہر کے وقت یوسف افراد خانہ کے علاوہ نسرین کی چچی ذکیہ اور ان کی بیٹی حمیرا کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ ذکیہ کے خاوند میجر محمد بشیر فوج میں ڈاکٹر تھے اور کُنبے میں عمر کے لحاظ سے وہ تیسرے نمبر پر تھے، نصیر الدین سب سے بڑے تھے، اُن سے چھوٹے عبدالعزیز تھے اور سب سے چھوٹے ڈاکٹر کمال الدین تھے۔

میجر محمد بشیر کا بیٹا رفیق احمد تھا۔ جس کی شکل و صورت بہت حد تک اپنی بہنوں سے ملتی تھی۔ ذکیہ بیگم کافی صحت مند اور خوش شکل عورت تھیں لیکن رنگ قدرے سانولا تھا۔ حمیرا کے نقوش اپنی ماں کی طرح تیکھے تھے لیکن رنگ قدرے کھلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ عمر میں نسرین سے بڑی اور فہمیدہ سے چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ گھر میں کسی کو ذکیہ اور اس کی بیٹی سے یوسف کا لمبا چوڑا

خوب صورت ہیں کہ یوسف آپ کی دعوت کو رد نہیں کرے گا۔ اور آپ نے اسے یہ بھی تو نہیں بتایا کہ وہاں دہرہ دون میں اس کی ملاقات سجاد کے ساتھ بھی ہوگی، یوسف بیٹا، سجاد حمیرا کا بھائی ہے اور ملٹری کالج میں پڑھتا ہے اور شکار کا اسے بھی کچھ شوق ہے تم اسے بہت کچھ سکھا سکو گے۔"

ذکیہ نے کہا "باجی میں آپ کو بتا ہی نہیں سکتی کہ سجاد کو انھیں دیکھنے کا کتنا اشتیاق ہے۔ رفیق کی باتیں سن کر وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ یوسف صاحب کوئی طلسماتی انسان ہیں۔ بڑی خوشی ہوگی بیٹا یوسف تمہارے آنے سے، کیا اچھا ہو کہ تم بی اے کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی وہاں آجاؤ۔"

"چچی جان، مجھے اپنے پروگرام کا کوئی علم نہیں، اگر وقت ملا تو میں ضرور آؤں گا۔"

نسرین نے کہا "چچی جان، ہمیں آپ نے دعوت نہیں دی، کم از کم نانی جان کو ہی دعوت دی ہوتی پھر میں تو ان کے ساتھ آجاتی نا۔"

"چڑیل، اپنے گھر آنے کے لیے بھی کوئی کسی کو دعوت دیا کرتا ہے، وہ تو میں باجی صفیہ کو فون کروں گی اور آپ سب گاڑی پر سوار ہو جائیے پھر وہاں ہمیں پوری چھٹیاں سیر کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوگا۔"

شام کے وقت یوسف سیر کے لیے جانے لگا تو نسرین نے حمیرا کو آواز دی "حمیرا باجی میں بھائی جان کے ساتھ سیر کے لیے جا رہی ہوں تم بھی چلو گی نا، حمیرا جواب دیئے بغیر اپنی چادر سنبھالتے ہوئے ان کے ساتھ ہوگئی۔

مکان سے باہر نکلتے ہی نسرین نے کہا "بھائی جان ہم اسٹیشن کی طرف جائیں گے یہ اس لیے ضروری ہے کہ آپ راستہ اچھی طرح دیکھ لیں، رات کو تو تانگے پر آپ کو راستے کا پتہ ہی نہیں چلا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے" یوسف نے کہا "لیکن اگر اسٹیشن کی طرف ہی جانا ہے تو تم نہ ید

تعارف کروانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ نسرین ان کے متعلق جو باتیں سنایا کرتی تھی وہ دور دور پہنچ چکی تھیں۔

نصیرالدین نے ریلوے اسٹیشن پر ہی انھیں یوسف کی والدہ کی وفات کی خبر سنا دی تھی۔ اور گھر میں اس کی تعزیت کے بعد وہ جلد ہی بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

کھانے کے دوران حمیرا نے کہا "بھائی جان، آپ کو جنگلی جانوروں کے شکار کا شوق ہے تو دہرہ دون ضرور آئیے۔ ابا جی کو بھی شکار کا بہت شوق ہے وہ اکثر اپنے دوست ناصر علی صاحب کے ساتھ شکار پر جایا کرتے ہیں، وہ کوئی بڑے زمیندار ہیں۔ ان کی ایک کوٹھی دہرہ دون میں ہے اور دوسری مسوری میں، پچھلے سال ہم نے گرمیوں کی چھٹیاں مسوری میں گزاری تھیں اور انہوں نے وہاں اب بھی اسی کوٹھی کا ایک حصہ ہمیں دے دیا تھا۔ اب ان کی طرف سے ہمیں اس سال کی دعوت ہے کہ ہم جب بھی مسوری ٹھہرنا چاہیں تو ان کی کوٹھی کے ایک حصہ پر قبضہ جما سکتے ہیں۔ ابا جان نے ان کے ساتھ ایک شیر اور ایک چیتے کے علاوہ کئی جانور مارے ہیں۔"

رفیق احمد نے کہا، "ہاں بھائی جان میں نے ناصر علی کے گھر میں کئی بارہ سنگھوں اور ہرنوں کی کھالیں دیکھی ہیں۔ اگر میں آپ کی طرح بندوق چلا سکتا تو ان کے ساتھ شکار پر جاتا اور شیر مار کر اس کی کھال یہاں لاتا، ہاں بھائی جان اور میں نے وہاں بہت بڑے اژدہے کی کھال بھی دیکھی ہے۔"

یوسف نے کہا "بھئی اگر موقع ملا تو وہاں ضرور جاؤنگا۔ مجھے بڑے جانوروں کے شکار کا بے حد شوق ہے لیکن میں مردہ جانوروں کی کھالیں گھر میں لٹکانا پسند نہیں کرتا۔"

ذکیہ نے کہا "باجی صفیہ مجھے یوسف کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے اور میں آپ کی موجودگی میں ان سے وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ یہ ہمارے ہاں ضرور آئیں گے۔"

صفیہ نے کہا "ہاں دہرہ دون کا علاقہ اور اس کے آگے مسوری کے پہاڑ اتنے

اور رفیق کو بھی لے آئیں۔"

"ہاں بھائی جان، میں انھیں ابھی لاتی ہوں، دیکھئے نا میں شور تو نہیں مچاؤں گی صرف ان کے کان میں کہوں گی کہ سیر کے لیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے وہ اس وقت سیر کے لیے نہیں جایا کرتیں، لیکن آپ کی خاطر وہ فوراً چل پڑیں گی۔"

یوسف نے کہا "نسرین تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ اگر انھیں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے تو ضرور لے آؤ۔"

نسرین بھاگتی ہوئی گئی اور تھوڑی دیر بعد فہمیدہ اپنی چادر سنبھالتی ہوئی اس کے ساتھ آ رہی تھی۔

یوسف نے کہا "نسرین میرا مطلب ہے، شہزادی نسرین یہ تو آپ کو وہم نہیں ہونا چاہیے کہ میں آپ کے گھر کا راستہ بھول جاؤں گا۔ رات کو آتے وقت تو میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا مگر جاتے ہوئے غور سے دیکھ کر جاؤں گا۔ اس لیے بھول جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم ان سنسان سڑکوں پر لمبی سیر کریں، جہاں بھیڑ نہ ہو اور جو تمہاری آپا کو خاص طور پر پسند ہوں۔"

نسرین نے کہا "پہلے آپا جان، آپ ہماری رہنمائی کریں، بھائی جان میں نے وہ فلم دیکھی تھی، وہ کیا ہوتا ہے جو افریقہ میں سیاحوں کی رہنمائی کرتا ہے۔"

یوسف ہنسا، "شہزادی صاحبہ، اسے سفاری کہتے ہیں اور سڑکوں پر سیر کرنے والوں کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ خطرناک جنگلوں میں شیروں، ہاتھیوں، گینڈوں اور مگرمچھوں کا شکار کرنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے۔"

یوسف فہمیدہ کی طرف متوجہ ہوا، "میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب موقع ملتا ہے تو کوئی بات یاد نہیں رہتی۔"

"ایسی باتیں آپ لکھ چھوڑا کریں شاید کسی دن آپ کے کام آئیں۔ عجیب بات ہے

کہ میری بھی یہی حالت ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں گھر جاتے ہی آپ کے مسودے کا ذکر چھیڑوں گی لیکن کل سے مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ آپ کی تحریر کے بارے میں اَن گنت باتیں مجھے آپ کے جانے کے بعد یاد آئیں گی۔"

حمیرا نے نسرین سے مخاطب ہو کر کہا "نسرین سیر کرنے والی سڑکیں تو دہرہ دون کی ہیں ہم جب بھی وہاں جاتے ہیں تم بہت یاد آیا کرتی ہو۔"

نسرین نے اپنی رفتار ذرا تیز کرتے ہوئے کہا "مسوری یقیناً بہت خوب صورت ہوگا لیکن کانگڑہ کے مناظر دنیا میں کہیں اور نہیں ہو سکتے۔"

انھیں آگے جاتا دیکھ کر فہمیدہ اور یوسف نے اپنی رفتار کم کر دی۔

یوسف نے کہا "فہمیدہ مجھے معلوم نہیں کہ ایک بات میں کتنی بار کہنا چاہوں گا اور کتنی بار مجھے بھول جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہ مل سکیں۔ بات بڑی مختصر ہے اور وہ یہ ہے کہ جب آپ میری آنکھوں سے اُوجھل ہوتی ہیں تو میں آپ کا تصور نہیں کر سکتا۔ میرا مطلب ہے کہ دنیا میں اَن گنت صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے نقوش ایک دفعہ دیکھنے سے ہمارے ذہن میں ثبت ہو جاتے ہیں لیکن تصور میں تمہاری جو صورتیں میرے سامنے آتی ہیں وہ ہر آن بدلتی رہتی ہیں مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ تمہیں دیکھنے پہچاننے اور تمہارے نقوش اپنے دل میں بٹھانے کے لیے مجھے صبح کی روشنی میں چند لمحات، چند دن اور چند مہینے کافی نہیں بلکہ مدتوں دیکھنے کی ضرورت ہے اس قدر انہماک کے ساتھ کہ میں آنکھ بھی نہ جھپک سکوں لیکن شاید تم نہیں سمجھ سکو گی۔"

فہمیدہ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا "میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں کیا سمجھ سکتی ہوں اور کیا نہیں سمجھ سکتی۔ آج میرے متعلق ایک مسئلہ آپ کے سامنے لایا جائے گا اور ہمارے گھر میں آپ کی رائے آخری سمجھی جائے گی۔ اس لیے

آخری سمجھی جائے گی کہ گھر میں امی اور ابا جان وہی پسند کیا کرتے ہیں جو میں پسند کیا کرتی ہوں۔
اور یوسف صاحب! میں بھی ایک بات کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے ابھی آپ کو دن کی روشنی میں اتنا نہیں دیکھا جتنا میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کل نہ جائیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو جب تک چچی جان یہاں ہیں آپ بھی یہیں ٹھہریں، شاید مجھے آپ کی کتاب کے متعلق کچھ کہنے کا موقع مل جائے۔"

یوسف نے کہا "میرا واپس جانا بہت ضروری ہے مگر تمہاری تھوڑی سی خوشی کے لیے میں رُک جاؤں گا۔"

"تھوڑی نہیں بہت زیادہ"۔

"نسرین" اس نے آواز دی "آؤ تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔"

نسرین حمیرا کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتی ہوئی ان سے آملی اور فہمیدہ نے کہا "خوشخبری یہ ہے کہ تمہارے بھائی جان کل نہیں جائیں گے میں نے انہیں کہا تھا کہ جب تک چچی جان اور حمیرا یہاں ہیں آپ یہیں رہیں لیکن فی الحال یہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ اس کے بعد یہ وعدہ تم لے لینا کہ جب بھی انہیں موقع ملے گا یہ جالندھر کا راستہ نہیں بھولیں گے۔"

حمیرا نے کہا بھائی جان، میں بھی آپ سے دہرہ دون آنے کا وعدہ لینا چاہتی ہوں۔ عثمان بھائی جان آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

یوسف نے کہا "اس وقت میں یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ کبھی اس طرف جانا ہوا تو میں سیدھا آپ کے گھر آؤں گا لیکن ملک کے حالات اتنے غیر یقینی ہیں کہ یقین کے ساتھ کوئی پروگرام نہیں بنایا جا سکتا۔"

نسرین "آپا حمیرا آپ مطمئن رہیں آئندہ جب کبھی ہم نے دہرہ دون جانے کا پروگرام بنایا تو انشاء اللہ بھائی جان ہمارے ساتھ ہوں گے"۔

یوسف نے فہمیدہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "آپ نے کہا تھا کہ گھر جا کر ایک اہم

مسئلے پر میرا مشورہ لیا جائے گا اگر یہ ابھی بتا دیں مسئلہ کیا ہے تو میں شاید کچھ سوچ سکوں اور مجھے یقین ہے کہ نسرین اور حمیرا بھی کوئی اچھی رائے دے سکیں گی۔"

فہمیدہ نے کہا "مسئلہ یہ ہے کہ مجھے نانا جان اور نانی جان کی خواہش کے مطابق میڈیکل اسکول میں داخلہ لینا چاہیے یا آرٹس کے لیے جالندھر یا لاہور میں پڑھنا چاہیے۔ چچا عبدالعزیز اور چچی بلقیس کا اصرار ہے کہ میں لاہور میں داخلہ لے لوں اور ان کے پاس رہوں وہ شاید اچانک کسی دن مجھے لینے بھی آجائیں۔"

یوسف نے کہا "میں اس مسئلہ میں کوئی رائے دینے سے پہلے شہزادی نسرین تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔"

"بھائی جان، افسوس تو یہی ہے کہ شہزادی کا حکم نہیں چلتا ورنہ میں یہ فرمان جاری کرتی کہ میری آپا جان کو ڈاکٹر بننے کی بجائے اپنے وقت کی سب سے بڑی ادیبہ بننا چاہیے اور آرٹس کے لیے ان کا لاہور جانا بہتر ہوگا۔ اگرچہ میں بہت تنہائی محسوس کیا کروں گی ان کی تو یہ عادت ہے کہ یہ آپریشن کرنا تو در کنار یہ تو کسی کو ٹیکہ لگتے دیکھ کر بھی آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔

"ایسی بات تو میں ان کے متعلق نہیں مانتا۔ ضرورت کے وقت یہ مسکراتے ہوئے بڑے سے بڑا اپریشن کر دیا کریں گی لیکن مسئلہ یہ ہے ان کے طبعی رجحان کا اور وہ تم نے کہہ ہی دیا ہے کہ یہ ایک ادیب کا ذہن لے کر پیدا ہوئی ہیں۔ پھر اگر یہ لاہور جائیں تو تمہاری یہ مشکل بھی تو بہت جلد حل ہو جائے گی کہ تم ان کے ساتھ آن ملو گی۔"

نسرین بولی "بھائی جان، اگر آپ نے یہ کہہ دیا امی جان انھیں بھی روک لیں گی۔"

یوسف فہمیدہ کی طرف متوجہ ہوا "فہمیدہ آپ ان لڑکیوں میں سے ہیں جو اپنے متعلق بہترین فیصلے کرنے اور اسے منوانے کا حق لے کر پیدا ہوئی ہیں۔ اگر ڈاکٹری کی طرف رجحان ہو تو یہ ایک مقدس پیشہ ہے لیکن اس صورت میں جبکہ آپ طبعاً ادب کی طرف راغب ہیں تو آپ کے لیے لاہور جانا بہتر ہوگا۔"

فہمیدہ نے کہا "اب گھر پہنچتے ہی اس مسئلے پر بات ہوگی اور چچا عبدالعزیز یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ آپ نے مجھے لاہور بھیجنے کا مشورہ دیا ہے۔"

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مَیں ماں جی کو خفا کرنا چاہتا ہوں۔"

فہمیدہ نے کہا "آپ کے مشورے کا سب سے بڑا فائدہ تو مجھے ہی ہوگا کہ نانی جان فوراً مان جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں فوراً واپس چلنا چاہیے"۔

یوسف نے کہا "لیکن حمیرا نے کوئی رائے نہیں دی۔"

حمیرا بولی "بھائی جان، میرا ووٹ بھی آپ کے ساتھ ہے۔ میرے ابا جان کی تو یہی خواہش ہے کہ فہمیدہ آپا ڈاکٹر بنیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اگر یہ کامیاب ادیب بن سکتی ہیں تو انہیں زبردستی ڈاکٹر بنا دیا جائے۔"

"میری تو حالت یہ ہے کہ مجھے آپا فہمیدہ ہر حالت میں اچھی لگیں گی خواہ یہ ڈاکٹر ہوں یا پروفیسر یا کچھ اور۔"

یوسف نے پوچھا "آپ یہ چاہیں گی کہ آپ کی کتابیں آپا لکھا کریں؟"

"کیوں نہیں، دُنیا میں ہر اچھی چیز میری آپا کے لیے ہونی چاہیے" "لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کتابیں لکھنے والوں کو کبھی کبھی بھوکا بھی رہنا پڑتا ہے۔"

"دیکھیں بھائی جان، آپ منحوس باتیں نہ کریں" اُس نے برہم ہو کر کہا۔

فہمیدہ نے کہا "آپ کو کبھی اپنے مسودے کا خیال نہیں آیا"۔

"خیال بہت آتا ہے اور کسی دن اچانک اس کو مکمل کرنے کے لیے بیٹھ جاؤں گا۔"

فہمیدہ نے کہا: "کبھی آپ کو یہ خیال آیا ہے کہ یہاں آکر مسودہ نامکمل ہے! میرا مطلب ہے کہ اس سے آگے بھی لکھا جائے اور یوسف کی سرگزشت کے باقی واقعات بھی اس میں شامل کیے جائیں۔"

یوسف نے کہا: "دیکھئے، یہ سرگزشت دو حصوں میں تقسیم ہوتی چلی جائے گی، دُوسرا

حصّہ جو میرے نزدیک بہت اہم ہے اور جسے پڑھنے والے بھی بہت اہمیت دیں گے وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جب امرتسر کے اسٹیشن سے ماں جی اور نسرین سے میرا راستہ جُدا ہو گیا تھا اور مَیں اپنا ہینڈ بیگ جس میں مسودہ بند تھا، جالندھر جانے والی گاڑی پر چھوڑ آیا تھا مجھے اپنے مسودے سے زیادہ اس بات کا ملال تھا کہ اس پر نسرین نے اپنا ایڈریس بھی لکھا ہوا تھا۔ اب اس حصّے کو مکمل کرنے کے لیے مَیں آپ سے کئی سوالات پوچھوں گا اور یہی وجہ ہے کہ مَیں کل رُک گیا ہوں۔ اصل مسودہ آپ کے پاس رہے گا اور مَیں جو کچھ لکھا کروں گا، اس کی ایک نقل بالاقساط آپ کو ملتی رہے گی۔"

فہمیدہ نے کہا "دیکھئے جو آپ کا اصل مسوّدہ تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے اور مَیں نے جو اُس کی ایک نقل رکھی ہے وُہ آپ کے سپرد کر دی جائے گی تاکہ آپ کو تسلسل قائم رکھنے میں آسانی رہے۔ اس سرگزشت کا جو حصّہ جالندھر سے تعلق رکھتا ہے اُس کے متعلق آپ کو زیادہ سوال پُوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ نسرین کو کوئی بات نہیں بھولتی اور میرا خیال ہے کہ اگر یہ ابھی سے وہ واقعات سُنانا شروع کر دے جو امرتسر سے جُدا ہونے کے بعد پیش آئے تھے تو آپ کو کئی سوالات کا جواب مل جائے گا، اور آپ کی تحریر نے جو مجھ پر اثر کیا تھا اُس کے متعلق بھی نسرین سے زیادہ آپ کو کوئی نہیں بتا سکتا۔"

نسرین نے کہا "بھائی جان! آپ کو اپنی پریشانی کا سارا حال سُناؤں گی، لیکن یہ غلط ہے کہ میں کوئی بات آپا جان سے بہتر کر سکتی ہوں۔"

یوسف نے کہا "بھئی یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتی ہو۔ یہ بات تو میں فہمیدہ کو دیکھے بغیر سمجھ گیا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کب معلوم ہُوا تھا کہ مَیں اپنا ہینڈ بیگ بھول گیا ہوں۔"

"اُسی وقت بھائی جان جب گاڑی چل پڑی تھی۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا احساس

تھا کہ مجھ سے کوئی حماقت ضرور ہوگئی ہے اور مَیں نے نانی جان سے بھی کہہ دیا تھا۔"

اور پھر نسرین بولتی چلی جا رہی تھی۔ دس منٹ بعد وہ گھر پہنچنے تک کے واقعات سُنا چکی تھی۔

یوسف نے آہستہ سے کہا "فہمیدہ یہ سیر ذرا لمبی نہ کریں، اس وقت شہزادی نسرین بولنے کے موڈ میں ہے۔"

فہمیدہ نے کہا۔ "ہم آگے سے دائیں ہاتھ مڑ جائیں تو شہزادی صاحبہ کو نصف گھنٹہ اور بولنے کا موقع مل جائے گا۔"

نسرین بدستور بولتی رہی اور گھر کے قریب پہنچ کر وُہ اُن دنوں کا ذکر کر رہی تھی جب فہمیدہ یوسف کا مسودہ پڑھا کرتی تھی۔ گھر کے پاس ہی ایک مسجد میں عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ یوسف نے فہمیدہ سے مخاطب ہو کر کہا "مَیں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ آپ میرے لیے ایک دستہ کاغذ منگوا لیں مَیں رات کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مَیں بی۔اے کرنے سے پہلے اس کتاب کا ایک حصّہ مکمل کر لوں گا۔

حمیرا نے پوچھا "بھائی جان ایک حصّہ کیوں پُوری کتاب کیوں نہیں؟"

"بھئی یہ کتاب ایک دیہاتی لڑکے کی سرگزشت ہے جس نے کئی کٹھن مراحل طے کرنے کے بعد ایک ناول نگار بننا ہے، پھر یہ بعض ایسے لوگوں کی سرگزشت بھی ہوگی جو ان کٹھن مراحل میں اُس کے ہمسفر ہوں گے۔ اس لیے لکھنے سے پہلے سرگزشت کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ اِس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اِس میں کتنا وقت لگے گا اور اس کے شائع ہونے تک مَیں کتنی اور کتابیں لکھ چکا ہوں گا۔"

حمیرا نے کہا۔ "بھائی جان میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا شاید نسرین سمجھتی ہو۔"

نسرین بولی "چلو گھر چلو۔ وہاں آپا جان تمھیں سمجھا دیں گی۔"

رات کھانا کھانے کے بعد یوسف اپنے کمرے میں گیا تو وہاں میز پر کاغذات اور روشنائی کی شیشی پڑی ہوئی تھی۔ یوسف کرسی پر بیٹھ گیا تو نسرین چمڑے کا ایک چھوٹا سا بکس اُٹھائے کمرے میں داخل ہُوئی اور اُسے میز پر رکھ دیا۔ یوسف نسرین سے کچھ پوچھنے والا تھا کہ فہمیدہ اور اس کی ماں کمرے میں آ گئیں اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

صفیہ نے کہا "بیٹا بیٹھے رہو۔ امی جان یہ سُن کر بہت خوش ہوئی ہیں کہ تم کچھ لکھنے لگے ہو۔"

"خالہ جان آپ تشریف رکھیں" یوسف نے کہا۔

صفیہ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بیٹا میں تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

"خالہ جان میرا وقت ضائع نہیں ہوگا بلکہ لکھنے کے لیے میرا موڈ بن جائے گا۔ فہمیدہ آپ بھی بیٹھ جائیں۔"

فہمیدہ بولی "نہیں۔ مَیں صرف آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ اس بکس میں آپ کا مسوّدہ اور ایک نیا قلم بھی ہے جو مَیں نے اس خیال سے خرید کر اس بکس میں رکھ دیا تھا کہ کسی دن آپ یہ مسودہ تلاش کرتے ہوئے ہمارے گھر آئیں گے اور مَیں یہ قلم آپ کو اِس درخواست کے ساتھ پیش کروں گی کہ اسے جلد ہی مکمل کیجئے۔"

یوسف مسکرایا۔ "لوگ مصنفوں کو اُس وقت قلم پیش کرتے ہیں جب وہ بہت مشہور ہو جاتے ہیں۔ اِس لیے مَیں اس قلم کو بہت بڑا انعام سمجھتا ہوں اور آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ نسرین مَیں تمہارا شکرگزار بھی ہوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی اِتنے بڑے قدر دان مل گئے ہیں۔"

صفیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "قدر دان بھی اور دعائیں کرنے والے بھی۔ اب تم اپنا کام کرو۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

یوسف نے بکس کھول کر پہلے فہمیدہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی خوب صورت جلد نکالی، شروع اور آخر کے چند صفحات پڑھے پھر نیا قلم نکالا اسیاہی بھری اور بسم اللہ کہہ کر لکھنے میں مصروف ہوگیا جب صبح کی اذان سنائی دی تو اُس نے قلم رکھ دیا اُٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھی اور میز پر بکھرے ہوئے کاغذ اکٹھے کیے بغیر سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو بیگم فریدہ احمد بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور بولا۔ "امی جی میں لکھتے لکھتے سو گیا تھا اور شاید بہت دیر سویا رہا۔"

"بیٹا تم لکھتے لکھتے نہیں نماز پڑھ کر سوئے تھے اور میرا خیال ہے کہ ابھی تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی اور ایک دلچسپ بات جو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ نصیر الدین تمہارے نئے لکھے ہوئے صفحات پڑھنے کے بعد اس بکس سے تمہارے مسودے کی نقل نکال کر لے گیا تھا۔

یوسف نے میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ کاغذ جو میں نے لکھے تھے؟"

"میرا خیال ہے وہ فہمیدہ کے پاس ہیں۔"

تم نے رات بھر جو کچھ لکھا تھا وہ سب سے پہلے فہمیدہ نے پڑھا تھا پھر صفیہ نے۔ پھر اُس سے نصیر الدین چھین کر لے گیا تھا اور اب میرا خیال ہے کہ ظہیر ذکیہ اور حمیرا کو پڑھ کر سُنا رہا ہے۔

چند منٹ بعد یوسف ناشتہ کر رہا تھا کہ نصیر الدین مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا

"بھئی یوسف! اگر تم اس بات پر خوش ہو سکتے ہو کہ میری عمر کا آدمی تمہارے قارئین کی جماعت میں شامل ہو چکا ہے اور تمہیں ہر سطر پہ داد دینا چاہتا ہے تو تم جی بھر کر خوش ہو سکتے ہو۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی نمناک آنکھوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرے لیے یہ بہت بڑا انعام ہے کہ آپ نے وہ پڑھ لیا ہے۔"

"بیٹا اصل بات یہ ہے کہ میں نے صرف چند صفحات پڑھے ہیں اور میں اسے پوری یکسوئی سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ فہمیدہ کسی معمولی بات سے متاثر نہیں ہوا کرتی لیکن تمہارا اندازِ تحریر مجھے بالکل انوکھا معلوم ہوتا ہے۔"

یوسف نے کہا۔ "نسرین، ذرا ادھر آنا میں پھر ایک بار تمہارا شکریہ ادا کردوں۔"

"کس بات پر؟ بھائی جان"۔ اس نے بھاگتے ہوئے قریب آکر کہا۔

"وہ بات یہ ہے کہ تمہاری وجہ سے میں بہت شفقت اور پیار کرنے والوں سے متعارف ہوا ہوں۔"

نصیر الدین کچھ دیر غور سے یوسف کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا "بیٹا، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم چند دن اور یہاں رُک جاؤ اور کچھ اور لکھ لو۔"

یوسف نے جواب دیا "جناب میں پھر آؤں گا اور آپ مجھ سے تنگ نہ آ گئے تو بار بار آتا رہوں گا، لیکن اس وقت مجھے جانا چاہیے، میں گاؤں میں دو دن ٹھہر کر لاہور چلا جاؤں گا۔"

نصیر الدین نے کہا "انشاء اللہ لاہور میں بھی ملاقات ہوتی رہے گی۔ فہمیدہ کے متعلق پہلے تو یہی سوچا گیا تھا کہ وہ کالج کی تعلیم کی ابتدا لاہور سے کرے لیکن چونکہ اس کا طبعی رجحان ڈاکٹری کی بجائے ادب کی طرف ہے اس لیے ایف اے تک یہیں پڑھے گی اور اس کے بعد لاہور چلی جائے گی، وہاں اس کا چچا اور چچی اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اگر فہمیدہ ڈاکٹر بننے کا شوق ظاہر کرتی تو ہمیں اسی سال لاہور بھیجنا پڑتا۔

"وہ مجھ سے بھی بہت پیار کرتے ہیں"۔ نسرین نے کہا۔

"لیکن ان کے پیار کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہیں بھی لاہور بھیج دوں گا۔"

"ابا جان، میں آپ کو چھوڑ کر لاہور کیسے جا سکتی ہوں اور نانی جان سے بھی میں دُور نہیں ہونا چاہتی۔"

نانی نے کہا "اجی میرے ساتھ مکر نہ کرو مجھے معلوم ہے جب تمہارا لاہور جانے کا وقت آئے گا تو تم نانی کو پوچھو گی بھی نہیں۔ نصیر الدین بیٹا کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ فہمیدہ کے بجائے نسرین ڈاکٹر بن جائے اور تم میڈیکل کیلئے اسے میرے پاس لدھیانہ بھیج دو۔"

صفیہ نے کہا "امی جان، بیٹی کو ابھی سے پریشان نہ کریں جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔"

نسرین نے کہا "امی جان میں پریشان نہیں ہوا کرتی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم جالندھر کی طرح لاہور میں بھی اکٹھے ہو جائیں اور نانی جان وہاں ہمیں ملنے کے لیے آیا کریں۔ نانی جان میں سچ کہتی ہوں، مجھے بڑا مزہ آتا ہے آپ کا انتظار کرنے میں۔"

اگلے دن نصیر الدین یوسف کو ریلوے اسٹیشن پر خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ گاڑی روانہ ہونے سے چند منٹ پہلے اس نے پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے کہا "یوسف رات میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی تمہارے گاؤں تک ہو آؤں لیکن پھر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تمہارے ابا جان لاہور آ جائیں گے تو ہم پہلے وہاں آئیں گے اور اس کے بعد کسی اچھے موقع پر تمہارے گاؤں جانے کا کوئی پروگرام بنائیں گے۔ ایک بات جو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی الجھن یا پریشانی ہو تو تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میرے گھر میں تم کبھی اجنبی نہیں سمجھے جاؤ گے۔"

یوسف نے جواب دیا "جناب میں تشکر کے الفاظ سے آپ کے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میری زندگی کا ایک عجیب اتفاق ہے کہ آپ مجھے اس وقت ملے ہیں جب مجھے آپ کی ضرورت تھی بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئٹہ سے میرا، نسرین اور اُس کی نانی جان کے ساتھ سفر کرنا اور پھر جب امرتسر سے میرا راستہ جدا ہو رہا تھا تو اپنے مسودے کو وہاں بھول آنے میں بھی ایک راز تھا کہ کسی دن میری زندگی میں ایک

بہت بڑا خلا پیدا ہونا تھا اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے آپ سب کو نمودار ہونا تھا۔ نصیر الدین صاحب میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ قدرت کو یہ معلوم تھا کہ کسی دن اچانک میں بہت بُری طرح گھائل ہو جاؤں گا اور میرے زخم مندمل کرنے کے لیے آپ آگے بڑھیں گے۔"

نصیر الدین نے اسے گلے لگا لیا۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اور نصیر الدین نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "بیٹا، خدا حافظ، میں ہمیشہ تمہارے لیے دعائیں کیا کروں گا اور دعا کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے لیے اور کر بھی تو کچھ نہیں سکتے۔"

گاڑی حرکت میں آ چکی تھی اور یوسف جلدی سے خدا حافظ کہہ کر گاڑی پر سوار ہو گیا۔ نصیر الدین بے حس و حرکت پلیٹ فارم پر کھڑا تھا، کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور جب گاڑی دور نکل گئی تو وہ آہستہ آہستہ اسٹیشن سے چل پڑا۔

باب - ۲۷

جالندھر سے واپسی پر یوسف تین دن گھر رہا اور اپنے والد سے اجازت لے کر لاہور چلا گیا۔ وہاں مکان پر نوکر موجود تھا، تاہم اسے وہاں رہتے ہوئے وحشت محسوس ہوتی تھی۔ تین دن اپنے مکان میں رہنے کے بعد وہ اپنے دوست منظور احمد کو جو چار طلبا کے ساتھ کالج کے قریب ایک مکان میں رہتا تھا اپنے ساتھ لے آیا۔ جب اُس کے والد اپنی چھٹی ختم کرنے کے بعد واپس آئے تو منظور پھر اپنے مکان میں چلا گیا تاہم اُن کے تعلقات اِتنے گہرے ہو چکے تھے کہ وُہ چھٹی کا دن عام طور پر یوسف کے گھر ساتھ گذارا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کالج کے اور ساتھی بھی ان کے ساتھ آجایا کرتے تھے۔ یوسف کی وجہ سے منظور کو بھی کشتی رانی سے دلچسپی ہو گئی تھی اور چھٹی کے دن وُہ عام طور پر طلوعِ آفتاب سے پہلے کشتی رانی کے لیے دریا پر پہنچ جاتے تھے۔ کبھی کبھی دو اور لڑکے محمد حفیظ اور عبدالمجید بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ کشتی رانی کے بعد وہ یوسف کے گھر آکر ناشتہ کرتے، کچھ دیر پاس ہی ایک باغ میں جاکر مطالعہ کرنا شروع کر دیتے۔ وہاں چند لڑکے اور جمع ہو جاتے تو تحریکِ پاکستان اور جنگ کی صورتِ حال کے متعلق باتیں شروع ہو جاتیں۔ اُن کے لیے دوپہر کا کھانا یوسف کے گھر تیار ہوتا تھا اور یوسف کے والد اُس کے دوستوں کی مہمان نوازی میں ایک راحت محسوس کیا کرتے تھے۔ یوسف نے اپنے کسی ساتھی کو

یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وُہ اپنی زندگی کا ایک عظیم ترین المیہ دیکھ چکا ہے تاہم منظور کبھی کبھی اُس کے ساتھ دل کی بات کر لیا کرتا تھا۔ دوسرے لڑکوں سے وہ زیادہ جانتا تھا۔ فروری کے دنوں میں یوسف نے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی شروع کر دی لیکن ایک دن اسے غیر متوقع واقعہ پیش آیا اُس کی چچی اور چچا گاؤں سے آئے اور اگلے دن اس کی ماموں زاد بہن سعیدہ بھی بہاول پور سے وہاں پہنچ گئی۔ ان کے درمیان ایک دن کوئی کھسر پھسر ہوتی رہی اور پھر سب یوسف کے کمرے میں آگئیں۔ چچی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”دیکھو یوسف اگر تم ناراض نہ ہو تو میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ بھائی جان عام طور پر رات کے وقت اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم وہ دن واپس نہیں لا سکتے جو انہوں نے آپا قدسیہ کے ساتھ گذارے تھے، مجھے وُہ زمانہ ایک خواب معلوم ہوتا ہے اور صرف مَیں ہی نہیں بلکہ سارا گاؤں بھی محسوس کرتا ہے۔ گاؤں میں ہم نے یہ مسئلہ چھیڑا تھا کہ بھائی جان دوسری شادی کر لیں لیکن تمہاری وجہ سے وہ ایسی بات سُننے کے لیے تیار نہیں۔“

یوسف نے جواب دیا۔ ”چچی جان آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میں اباجی کو اس طرح مغموم دیکھنا پسند کرتا ہوں۔“

”بیٹا تم پسند نہیں کرتے لیکن تمہارے اباجی کا یہ خیال ہے کہ تمہاری دل آزاری ہو گی۔“

”آپا سعیدہ کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں۔“

”بھائی میں کچھ نہیں سمجھتی مجھے چچی کے خطوط آئے تھے اور مَیں یہ سوچ کر یہاں پہنچ گئی ہوں کہ تم مجھ سے بہتر سوچ سکو گے۔“

یوسف نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔ ”میں ابھی اباجی سے بات کرتا ہوں۔“

ایک منٹ بعد وُہ دوسرے کمرے میں اپنے والد سے کہہ رہا تھا۔ ”اباجی! میں یہ محسوس کرتا ہوں

کہ یہ تنہائی کی زندگی آپ کے لیے بہت تکلیف دہ ہوگی۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ آپ کو کسی اچھے گھرانے کی خاتون سے شادی کر لینی چاہیے لیکن مجھے یہ بات کہنے کی جرأت نہیں پڑتی تھی۔ اب آپا سعیدہ اور چچی جان کے خیالات معلوم کرنے کے بعد مجھے اس بات پر بے حد ندامت محسوس ہوئی ہے کہ میں نے ایک فرمانبردار بیٹے کا فرض ادا نہیں کیا۔"

باپ نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچ کر اپنے قریب لاتے ہوئے کہا "یہ باتیں شروع میں ہوئی تھیں تو میں نے گاؤں میں ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے سے کسی بڑے خاندان کی عورت کی ضرورت نہیں، ایک ایسی نیک طبیعت خاتون کی ضرورت ہے جو میرے بچوں کی خدمت کر سکے۔"

"ابا جی! اس بات کا فیصلہ آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے جو کوئی بھی اس گھر میں آئے گی ہم اپنی ماں سمجھ کر اس کی عزت کریں گے۔"

"بیٹا اگر تم اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس کیے بغیر یہ بات کر رہے ہو تو اپنی چچی سے پوچھ لو وہ میرے لیے کیا پسند کرتی ہے۔"

"ابا جی میں ابھی پوچھتا ہوں۔"

یوسف واپس اپنی چچی اور سعیدہ کے پاس آ بیٹھا اور اُس نے کہا "چچی جان اگر آپ مجھے اپنی پسند کی خاتون بتا دیتیں تو میں اِسی وقت ابا جان سے یہ فیصلہ کر لیتا۔"

"بیٹا مجھ سے زیادہ یہ تمہاری بہنوں کی پسند کا مسئلہ ہے۔ زہرہ نے اُسے پسند کیا تھا تمہاری بہن بھی اُسے جانتی ہے، اُس کی تائید کرتی ہے۔"

"چچی جان! کہاں گئی تھی اُسے دیکھنے کے لیے، وہ کون ہے جسے میں نہیں جانتا اور آپ جانتی ہیں۔"

"بیٹا وہ چراغ بی بی ہے اور تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو۔"

"کیوں زہرہ یہ وہی چراغ بی بی ہے جسے ہم سب جانتے ہیں۔"

"بھائی چراغ بی بی ایک ہی تو ہے۔"

"کیوں آپا سعیدہ تم بھی اُسے پسند کر آئی ہو۔"

"دیکھو بھائی میری طرف اِس طرح نہ دیکھو مجھے یہ خط ملا تھا کہ تمہارے ابا جان اُسے قبول کرنے پر رضامند نظر آتے ہیں اور اس خط میں یہ بھی تاکید کی گئی تھی کہ میں یہاں آنے سے پہلے اُسے اچھی طرح دیکھ آؤں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایسی عورتوں کو اچھی طرح کیسے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ گاؤں سے لاہور آنے کے بعد بھی کافی عرصہ وہ تمہارے گھر آیا کرتی تھی اور انہوں نے تمہارے بہت سے کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ پھر وہ یکایک یہاں سے غائب ہو گئیں۔ میں نے پتہ کیا تو یہ راز کھلا کہ وہ اپنے گاؤں اس امید سے گئیں تھیں کہ ہم وہاں پیغام لے کر جائیں گے۔ میں چراغ بی بی کی ماں کو دیکھ کر کچھ پریشان ہوئی تھی لیکن اس کے باپ کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ بہت اچھا ہے۔"

یوسف نے کہا "آپا جی! آپ کسی کو دل کا اچھا یا دل کا بُرا نہ کہا کریں۔ کیونکہ آپ کی سوچ ہمیشہ حقیقت کے اُلٹ ہوتی ہے۔ بہر حال اگر آپ سب کو چراغ بی بی پسند ہے اور ابا جان بھی اُسے ناپسند نہیں کرتے تو میں بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گا، لیکن میرے امتحان کے دن قریب آ رہے ہیں اِس لیے آپ جس مقصد کے لیے آئی ہیں اُسے جلد از جلد پورا کر لیجیے۔"

دو ہفتے بعد یوسف کے دو چچا اور ان کے والد کے چچا اپنی بیگمات کے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔

بیگمات گھر میں ٹھہر گئیں اور یہ لوگ عبدالکریم اور اس کی بیوی کے ساتھ امرتسر روانہ ہو گئے۔ سفر کے لیے دو کاریں عبدالکریم نے مہیا کیں اور ایک کار لے کر عبدالعزیز پہنچ گئے۔ بلقیس کا بڑی شدت سے انتظار تھا اور یوسف کی یہ خواہش تھی کہ وہ عبدالعزیز صاحب

کے ساتھ جائے لیکن عبدالعزیز نے آتے ہی کہا" بھئی یوسف بلقیس آج سفر کے موڈ میں نہیں تھی اور ان کا موڈ اس لیے بدل گیا تھا، جب میں نے یہ بتایا تھا کہ تم گھر کے انتظامات کے لیے یہیں رہو گے"۔

"چچا جان، آپ نے انہیں بتا دیا ہوتا کہ میرا گھر میں رہنا ضروری تھا اور یہ بات بھی تو کچھ عجیب تھی نا کہ میں ....

"بیٹا میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں اور شاید اسی احساس نے تمہاری چچی کو وہاں جانے سے روک دیا ہے۔ بہرحال ہمیں اللہ سے بہتری کی دعا کرنی چاہیے۔ میں تمہاری اور تمہاری چچی کی نمائندگی کے لیے تمہارے والد کے ساتھ جا رہا ہوں"۔

اگلے روز یوسف ظاہری مسکراہٹوں کے باوجود بے حد اداس معلوم ہوتا تھا وہ سارا دن گھر سے باہر نہ نکلا۔ شام کے وقت امرتسر جانے والی بارات واپس آگئی۔ یوسف مکان کے دروازے سے باہر ان کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ عبدالکریم کی بیوی دلہن کو کار سے نکال کر مکان کی طرف بڑھی۔ چراغ بی بی سمٹی سمٹائی اندر داخل ہوئی۔ یوسف نے آگے بڑھ کر اپنے والد کو سلام کیا اور انہوں نے ہاتھ ملا کر اسے گلے لگا لیا اور پھر اسے لے کر دوسرے مہمانوں کے ساتھ بیٹھک میں چلے گئے۔

صحن کے اندر خواتین چراغ بی بی کو پلنگ پر بٹھا کر سلامیاں دے رہی تھیں اور دلہن کے لباس میں وہ اس چراغ بی بی سے بہت مختلف معلوم ہو رہی تھی جسے وہ دیکھا کرتی تھیں۔ اس ہجوم میں یوسف کے رشتہ داروں کے علاوہ امینہ بھی موجود تھی۔ چراغ بی بی کی ماں جو دو گھنٹے قبل وہاں پہنچ گئی تھی اپنی بیٹی کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

یوسف کچھ دیر اپنے رشتہ داروں اور مہمانوں سے باتیں کرنے کے بعد نمازِ عصر کے لئے مسجد میں چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو مہمانوں کے

ساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ چائے ختم ہوئی تو عبدالرحیم مہمانوں کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد یوسف کو بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے اور انہوں نے پوچھا: "بیٹا! تم کہاں غائب ہو گئے تھے"؟

"جی میں نماز کے لئے مسجد چلا گیا تھا ___"

"بیٹا، تم اب تک اپنی ماں سے نہیں ملے"؟

"ابا جان، صحن عورتوں سے بھرا ہوا ہے"۔

"تم زہرہ سے کہو اسے اندر لے آئے"۔

یوسف نے زہرہ کو آواز دی، وہ اندر آئی تو میاں عبدالرحیم نے کہا" بیٹی عبدالکریم کی بیوی یا بیٹی کو کہو تمہاری ماں کو یہاں لے آئے۔ زہرہ واپس چلی گئی، تھوڑی دیر بعد رشیدہ اور امینہ چراغ بی بی کو بازوؤں کا سہارا دیتے اندر داخل ہوئیں، زہرہ اور اس کی چچی اس کے پیچھے تھیں۔ یوسف اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میاں عبدالرحیم نے کہا" چراغ بی بی تمہیں سب سے پہلے میرے اس بیٹے سے ملنا چاہیے تھا جس پر میں فخر کیا کرتا ہوں"۔ چراغ بی بی نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا سر پکڑ لیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "جی یوسف پر سارا خاندان فخر کرتا ہے اور میں بھی اسے بیٹا کہتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہوں"۔

یوسف کا چہرہ حیا اور غصے سے اچانک سرخ ہو گیا اور اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" آپ بیٹھ جائیں"۔

جب وہ بیٹھ گئی تو اس کی ماں بھی اندر آگئی۔ یوسف اپنی آستین سے پیشانی پونچھتا ہوا وہاں سے کھسکا اور صحن کے ایک کونے میں نلکے کے پانی سے اپنی پیشانی رگڑ رگڑ کر دھونے لگا اور پھر وضو کرنے کے بعد ڈیوڑھی سے سائیکل اٹھا کر باہر نکل گیا۔

یوسف کے والد مغرب کی نماز کیلئے گھر سے نکلے تو امینہ چراغ بی بی کو ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور اُس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "آپا چراغ بی بی، یہ تم سے کس بے وقوف نے کہا تھا کہ تمہارے لیے اُس کا ماتھا چُومنا بھی ضروری ہے، خُدا کا شکر کرو کہ اُس نے غصہ ضبط کر لیا تھا ورنہ یوسف کا چہرہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہُوا تھا کہ وہ اچانک تمہارا گلا گھونٹ ڈالے گا، تم نے اُس کے ہاتھ نہیں دیکھے۔ اگر وہ اچانک تمہاری گردن پر پہنچ جاتے تو کوئی تمہاری جان نہیں بچا سکتا تھا۔ تمہیں ایڑیاں اُٹھا کر اُس کی پیشانی تک پہنچتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔" چراغ بی بی غصے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھ رہی تھی، اُس کی ماں نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی بیٹی تم کیا مشورہ کر رہی ہو" امینہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "جی، مجھے آپا جی سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" امینہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ ماں نے بیٹی سے کہا "بیٹی، کیا بات ہے تمہارا چہرہ اترا ہُوا ہے"۔ اس نے آنسو بہاتے ہُوئے کہا "امی، امینہ مجھ سے جلتی ہے، وُہ سب مجھ سے جلتے ہیں"۔

"کیا کہا تمہیں اس نے؟"

"امی وہ نہیں چاہتی کہ مَیں یوسف کی ماں کہلاؤں"۔

اس کی ماں عالم بی بی نے کہا "بیٹی، مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ لوگ تمہارا سُکھ برداشت نہیں کریں گے لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔



یوسف نمازِ مغرب کے بعد اپنی ماں کی قبر پر کھڑا تھا، قبرستان کے سکوت میں بیٹھ کر پہلی بار وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے ماضی کے متعلق کچھ سوچ رہا تھا اُسے ایسا

محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے حال اور مستقبل کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ اچانک اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اس نے مڑ کر دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "کون ہے؟"

"جی مَیں فضل دین ہوں" آنے والے نے بہت بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ آپ کو گھر سے نکلے بہت دیر ہو گئی تھی اور وہاں سب پریشان تھے۔ امینہ کو اچانک کوئی خیال آیا اور وُہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کار پر اس طرف نکل آئیں"۔

یوسف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "وُہ یہاں آئی ہیں؟"

"جی ہاں، وُہ باہر سڑک پر کھڑی ہیں اور وہ آپ کی ناراضگی کے ڈر سے یہاں نہیں آئیں۔ اب میں آپ کی سائیکل لے آتا ہوں اور آپ امینہ بی بی کے ساتھ جلدی گھر پہنچ جائیں۔ صاحب، جی مَیں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ امینہ بی بی اتنی نرم دل بھی ہو سکتی ہیں لیکن آج معلوم کیا ہوا کہ وُہ رو رہی تھیں اور اپنے ماں باپ کے متعلق بھی یہ کہہ رہی تھیں کہ انھوں نے آپ پر ظلم کیا ہے، وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ اس نے چراغ بی بی کی بڑی بے عزتی کی ہے"۔

یوسف نے کہا "اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا"۔

"جناب یہ بات آپ اُسے سمجھا سکتے ہیں۔ کیونکہ سب سے زیادہ وُہ آپ کا کہا مانے گی"۔

فضل دین نے چند قدم دُور جا کر سائیکل پکڑ لیا اور یوسف اس کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سڑک پر امینہ کو اپنی کار کے ساتھ کھڑی دیکھ رہے تھے۔

یوسف نے آگے بڑھ کر کہا "دیکھئے آپ کو اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا یہ اچھا کیا آپ آگے نہیں آئیں ورنہ قبرستان اور خاص کر اس موسم میں محفوظ جگہ نہیں۔ یہاں سانپ ہوتے ہیں، بہت زہریلے سانپ"۔

امینہ بولی، "مَیں سانپوں کے خوف سے یہاں نہیں رُکی، صرف اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں آپ دیکھتے ہی مجھ پر برس نہ پڑیں"۔

"کتنی غلط فہمی ہے آپ کو میرے متعلق۔ آپ کو یہ کبھی خیال نہیں آیا کہ مَیں کسی کی

دل آزاری نہیں کر سکتا۔"

"جی اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں یہاں تک آنے کی جرأت بھی نہ کرتی، اب اگر آپ کو میرے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہ ہو تو جلدی کیجئے وہاں لوگ بے حد پریشان ہیں — فضل دین آپ کی سائیکل لے آئے گا۔"

یوسف کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ کار پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر دونوں خاموش رہے، پھر امینہ نے کہا "جب میں کار اسٹارٹ کر چکی تھی تو میں نے بیگم بلقیس صاحبہ کو آتے دیکھا تھا، میں نے کار روکی تھی لیکن ان کا ڈرائیور آگے نکل گیا تھا پھر بھی میرا خیال تھا کہ بیگم بلقیس نے مجھے یقیناً دیکھ لیا ہوگا اگر وہ رک جاتیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی آپ کی تلاش میں آجاتیں۔ میں اس بات سے بہت ڈرتی تھی کہ آپ مجھے دیکھ کر خفا ہو جائیں گے۔

"آپ جن حالات میں گھر سے باہر نکلے تھے۔ میں اُن کے باعث پریشان ہو گئی تھی اور پھر آپ کی تلاش میں نکل پڑی تھی۔ مجھے خیال آیا تھا کہ شاید آپ اپنی امی جان کی قبر پر گئے ہوں گے اور عجیب بات ہے کہ میرا خیال درست نکلا۔"

"امینہ میں اس بات پر خفا نہیں ہوں اور میں چراغ بی بی کو بھی قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔ اگر میں تھوڑی دیر تک ٹھنڈے دل سے سوچتا تو شاید گھر والوں کو پریشانی نہ ہوتی، مجھے اب خیال آرہا ہے کہ چراغ بی بی نے میری ماں کو جان کنی کی حالت میں بھی پیار کرتے دیکھا تھا۔ شاید اس نے پہلے بھی امی کو میرا ماتھا چومتے دیکھا ہو اور اس بات کو ایک ماں کی حیثیت سے اپنے فرائض میں شامل کر لیا ہو۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس مسئلے کو آئندہ زیرِ بحث لایا جائے۔ میں اُسے خوش رکھنے کی کوشش کروں گا یہ اور بات ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نہ ہو۔"

"یوسف صاحب"، امینہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ "آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو صرف

دوسروں کی اچھائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں لیکن دنیا کا ہر انسان آپ جیسا نہیں۔ چراغ بی بی کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بے وقوفی ہوئی تھی لیکن آپ نے اس کی ماں کو غور سے نہیں دیکھا مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اس سے خوف کھاتی ہوں یہاں تک کہ مجھے اس کے پیار سے خوف آتا ہے۔ آپ بُرا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گی کہ آپ کو اس سے بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

"میں اسے بھی خوش رکھنے کی کوشش کروں گا اور تمہیں ان مسائل کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ دنیا میں پہاڑ سا بوجھ اٹھانے کے لیے پہاڑ بننا پڑتا ہے میں پہاڑ تو نہیں لیکن میں چھوٹی موٹی تلخیاں بڑی ہمت کے ساتھ برداشت کر لوں گا۔"

"یوسف صاحب میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ اللہ نے آپ کو کتنی ہمت اور کتنا حوصلہ دیا ہے۔ کاش میں آپ کی طرح ایک ادیب ہوتی اور آپ کے متعلق ایک کتاب لکھ سکتی۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں باتیں عجیب آتی ہیں آپ کے ذہن میں۔"

"یوسف صاحب میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ میرے ساتھ گاڑی پر بیٹھ گئے ہیں۔"

"بھئی شکریہ مجھے ادا کرنا چاہیے کہ آپ میری تلاش میں نکل پڑی تھیں، میں اتنا ناشکر گزار تو نہیں ہو سکتا کہ آپ گاڑی لے کر سڑک پر کھڑی ہوں اور میں آپ کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیتا۔ ویسے مجھے یہ خیال آیا تھا کہ آپ کو پیچھے بٹھا کر مجھے کار خود چلانی چاہیے۔"

امینہ نے گاڑی روکتے ہوئے کہا "یوسف صاحب میں اب بھی پیچھے بیٹھنے کے لیے تیار ہوں۔"

"اب تو ہم گھر پہنچنے والے ہیں اب چلو۔"

امینہ نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا، "یوسف صاحب میں دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

گاڑی گھر کے قریب پہنچی تو بلقیس گلی سے نکل رہی تھی اور اس کا ڈرائیور دروازہ کھول رہا تھا۔ امینہ نے گاڑی روکی اور یوسف جلدی سے اتر کر بلقیس کی طرف بڑھا اور اس نے پوچھا،

"چچی جان! آپ جا رہی ہیں؟"

بلقیس نے اسے امینہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا وہ چند ثانیے خاموش رہی اور پھر کہنے لگی،

"مَیں نے تمہارا کافی انتظار کیا ہے"۔

"چچی جان میں صبح آپ کے پاس حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن گھر کے کاموں میں الجھا رہا اور پھر مجھے یہ بھی امید تھی کہ آپ کسی وقت یہاں آئیں گی۔"

"بیٹا! مَیں آئی تھی تو تم گھر میں نہیں تھے اور یہ کوئی بھی نہیں بتا سکا کہ تم کہاں گئے ہو۔ امینہ کو مَیں نے نوکر کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن تم اس وقت کار پر نہیں تھے۔"

"چچی جان مَیں سائیکل پر باہر نکلا تھا۔ یہ لوگ مل گئے تو مَیں نے اپنی سائیکل امینہ کے نوکر کے حوالے کر دی۔

بلقیس نے کہا" یہ بھی اچھا ہوا کہ امینہ کو تمہارے پروگرام کا علم تھا ورنہ گھر میں بہت پریشانی تھی۔ اچھا اب تم آرام کرو مَیں جاتی ہوں تمہارے چچا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

یوسف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بلقیس نے کار پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اور ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی۔

اگلے دن وہ صبح ہوتے ہی بلقیس کے گھر پہنچا تو میاں عبدالعزیز دفتر جا چکے تھے۔

اس نے السلام علیکم کہنے کے بعد بلقیس سے کہا "چچی جان آپ میرے لیے ایک الجھن چھوڑ آئی تھیں، مَیں کافی دیر سو نہ سکا۔ مَیں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ میں کسی پروگرام کے ساتھ گھر سے نہیں نکلا تھا اور امینہ کو یہ علم نہیں تھا کہ مَیں کہاں جا رہا ہوں۔ بہر حال وہ میری تلاش کے لیے نکلی تو مَیں اپنی ماں کی قبر پر کھڑا تھا۔ شاید یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آسکے کہ مَیں ماں کی قبر پر کیوں گیا تھا۔"

یوسف کی آواز بھرا گئی۔ بلقیس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹا! تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، مَیں سمجھ سکتی ہوں کہ تم اپنی ماں کی قبر پر کیوں گئے تھے۔ اگر تم میرے گھر سے ہو کر جاتے تو شاید میں بھی تمہارے ساتھ چلتی، تمہارے گھر نہ آنے کی وجہ یا امرتسر نہ جانے کی وجہ یہی تھی کہ میرے دل میں تمہاری ماں کی موت کے زخم اچانک تازہ ہو گئے تھے اور آج بھی سب کے سامنے تمہیں امینہ کے ساتھ دیکھ کر مجھے یقیناً غصہ آیا مگر اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرے طرزِ عمل سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہے۔ بیٹا مجھے معاف کر دو، کبھی کبھی مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مَیں کیا کہہ رہی ہوں۔"

یوسف نے کہا "چچی جان عام حالات میں مَیں شاید اس کے یا کسی اور لڑکی کے ساتھ کار پر بیٹھنا مناسب نہ سمجھتا لیکن کل میرا دماغ جواب دے چکا تھا۔"

"بیٹا بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو؟"

"نہیں چچی اب مَیں چلتا ہوں۔"

"اچھا تم مجھ سے وعدہ کرو جب بھی تمہیں کوئی پریشانی ہوگی، تم میرے پاس آیا کرو گے۔"

"چچی جان، میں ضرور آیا کروں گا لیکن اپنی پریشانیوں میں آپ کو حصے دار نہیں بناؤں گا۔"

"ہاں بیٹا، مَیں شاید اس قابل بھی نہیں ہوں کہ تمہاری پریشانیوں میں حصہ دار بن سکوں۔"

"چچی جان، میرا مطلب یہ نہیں تھا، مَیں یہ کہنا چاہتا تھا کہ بیٹے جوان ہو جائیں تو وہ ماؤں کو اپنی پریشانیوں میں حصہ دار نہیں بنایا کرتے اور مَیں اس رات شاید ایک بچے سے اچانک جوان ہو گیا تھا۔ جب امی جان چلی گئیں تھیں۔ چچی جان اگر کبھی مجھے بچہ بننے یا بچے کی طرح رونے کا خیال آیا تو آپ کے گھر کے علاوہ کسی اور گھر کو موزوں نہ سمجھوں گا لیکن آپ کو بھی میرے

لیے یہ دعا کرنی چاہیے کہ میں کسی کو پریشان نہ کروں۔ میں عجیب قسمت لے کر پیدا ہوا ہوں۔
جن لوگوں نے مجھ سے پیار کیا تھا وہ اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پہلے چچا شیر علی
اور میرے پردادا چل بسے۔ پھر امی جان کی باری آئی۔ میں آپ کے لیے دعا کیا کرتا ہوں
کہ اللہ آپ کی عمر بہت لمبی کرے اور جب تک میں بوڑھا نہیں ہو جاتا آپ اور چچا جان سلامت رہیں۔"

"بیٹا تمہیں پیار کرنے والے اور بھی تو بہت ہیں۔" بلقیس نے جواب دیا۔

"جی ہاں ان کے لیے دعا کیا کرتا ہوں جب کوئی میرے دل کے قریب آتا ہے تو
یہ خوف طاری ہونے لگتا ہے کہ وہ مجھ سے چھین نہ جائے۔"

"لیکن تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ کتنے لوگ تمہارے لیے دعا کرتے ہیں۔"

"چچی جان اس کے لیے بھی میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اب مجھے اجازت دیں۔"

یوسف السلام علیکم کہہ کر چلنے لگا تو بلقیس نے اسے آواز دے کر کہا "بیٹا ٹھہرو میں
تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتی ہوں، فہمیدہ بہت جلد یہاں آ رہی ہیں۔ انشاء اللہ وہ
چند دن یہاں گزارے گی۔ نسرین بھی اس کے ساتھ ہوگی۔ ان کے صحیح
پروگرام کا ٹیلیفون پر گفتگو سے معلوم ہو جائے گا۔ اگر تم آج رات ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ تو ان
سے گفتگو بھی کر سکو گے۔ میرا مطلب ہے اگر تمہارا وقت ضائع نہ ہو۔" بلقیس مسکرا رہی تھی

"چچی جان میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن آپ کو یہ خیال ہے کہ میرا وقت
ضائع ہوگا۔ اب تو میری یہ حالت ہے کہ وقت میرے لیے ایک سزا بن چکا ہے۔
رات مجھے نیند نہیں آتی تھی اور آج بھی اگر میں یہ اطمینان لے کر نہ جاتا کہ آپ میری
حماقت پر خفا نہیں ہیں تو مجھے نیند نہ آتی۔ چچی جان نیند کا نہ آنا ایک بہت بڑی سزا
ہے۔"

بلقیس نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "بیٹا تم نے
کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ غلطی میری تھی دیکھو جا کر بیٹھک میں سو جاؤ ہم رات کو ٹیلیفون کریں گے

"نہیں چچی جان اب آپ مجھے اجازت دیں تو میں رات سے پہلے آ جاؤں گا۔"



اس دن وہ بہت خوش تھا۔ شام کے وقت منظور اس کے پاس آیا تو وہ دونوں
چائے پی کر سائیکلوں پر راوی کی طرف چلے گئے۔ وہاں مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے
ایک کشتی لی اور یوسف کئی ہفتوں کے بعد دریا کے بہاؤ کے خلاف خوشی خوشی کشتی چلا
رہا تھا۔

منظور نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ تم بہت ہشاش بشاش نظر آ رہے ہو"۔ یوسف نے کشتی
دوسرے کنارے لگاتے ہوئے کہا "دیکھو منظور اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے میرے
جیسے آدمی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی پر یقین رکھتا ہو یا کسی کے لیے
زندہ رہنا یا مرنا چاہتا ہو۔ کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ رات کالے بادلوں کے باعث
ستاروں کی ضیا پاشیوں سے محروم ہوتی ہے پھر اچانک کسی جگہ سے بادل پھٹ جاتے
ہیں اور کوئی ستارہ پوری تابانیوں کے ساتھ نظر آتا ہے اور تھکے ہارے مسافروں کو
اپنا راستہ اور منزل دکھائی دینے لگتی ہے۔ منظور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے
مقدر کے ستارے کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کر چکا ہوں لیکن اس کی تفصیلات کے
لیے میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

"یوسف میرے لیے اصل مسئلہ اس دنیا میں تمہاری خوشی ہے اور یہ میں تمہاری آنکھوں
سے دیکھ سکتا ہوں اور مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ تمہارے مقدر کا روشن ستارہ کون ہے۔
یوسف تمہیں معلوم ہے کہ جب سے تمہاری امی جان فوت ہوئی ہیں میں تمہارے
لیے کتنی دعائیں کیا کرتا ہوں میں ہمیشہ تمہیں مسکراتا اور قہقہے لگاتا ہوا ساتھی دیکھنا چاہتا
ہوں جس کے متعلق مجھے پہلی ملاقات کے ساتھ ہی یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ دنیا میں نام
پیدا کرے گا اور میں اس کا دوست کہلانے پر فخر کروں گا۔ اب نماز کا وقت ہو رہا ہے

اور آج یہاں ریت پر مَیں تمہارے پیچھے نماز پڑھوں گا۔" اُنھوں نے وضو کیا اور دریا کے کنارے خشک ریت پر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز ختم کرنے کے بعد جب وہ دوبارہ کشتی پر سوار ہوئے تو یوسف کہہ رہا تھا "منظور کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اللہ میرے حال پر بہت مہربان ہے۔ ماں کی موت کے بعد مَیں نے اپنے دل پر جو زخم محسوس کیے تھے وُہ مندمل ہو رہے ہیں اور بعض فرشتے مجھے کھینچ کر جنّت کی طرف لا رہے ہیں اور ان فرشتوں میں سے ایک تم بھی ہو، مَیں تمہاری نیک دعاؤں کے لیے شکر گزار ہوں۔ کبھی کبھی مجھے یہ تلخی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی تاریک سایہ میرا پیچھا کر رہا ہے لیکن پھر کسی ساتھی کی آواز سُنائی دیتی ہے اور یہ تاریک سائے روپوش ہو جاتے ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں منظور۔"

"بھائی شکریہ مجھے ادا کرنا چاہیے جسے تم نے یہ احساس دلایا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں مجھ جیسے عاجز کی دعائیں بھی قبول ہو سکتی ہیں۔ آج سے مَیں تمہارے تصوّر کے ستارے کے لیے بھی دعائیں کیا کروں گا اور وہ دن میرے لیے انتہائی خوشی کا دن ہو گا جس دن تمہاری زبان سے یہ سنوں گا کہ تم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہو۔"

کشتی کنارے پر لگی یوسف نے حسبِ معمول کشتی والے کو پیسے دینے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو منظور نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "نہیں یوسف صاحب، آج سے کشتی والے کو میں پیسے دیا کروں گا۔"

یوسف نے کوئی مزاحمت نہ کی اور منظور نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر کشتی والے کو دے دیا۔



رات کے وقت یوسف عبدالعزیز کے گھر پہنچا تو وہاں کھانے کی میز پر اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ بلقیس نے اُسے دیکھتے ہی کہا

"یوسف تم ذرا دیر سے آئے ہو، ہمیں جالندھر کی ٹیلی فون کال بُک کراتے ہی مل گئی تھی۔ وُہ سب بخیریت ہیں اور تمہارے چچا نے ان سے کافی دیر گفتگو کی تھی۔"

عبدالعزیز نے یوسف کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا:

"بیٹا مَیں کھانا کھاتے ہی ایک ضروری کام سے دفتر چلا جاؤں گا اور یہ ممکن ہے کہ مَیں پچھلے پہر تک واپس نہ آسکوں تو تم اطمینان سے کھانا کھاؤ اور میری بات سُنتے رہو۔ میں ایک مدّت سے ایک اہم فریضہ پُورا کرنے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ تمہاری چچی سے بہن قدسیہ نے آخری وقت جو باتیں کی تھیں اُن سے صرف مَیں ہی نہیں ہمارا پُورا خاندان متاثر ہے۔ اگر بلقیس نے تمہیں وُہ باتیں نہیں بتائیں تو کسی وقت ان سے پُوچھ لینا۔ جہاں تک تمہارے مستقبل کے متعلق فہمیدہ کے والدین اور دوسرے عزیزوں کا تعلق ہے۔ اُن کے لیے یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ اللہ نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے اور بیٹی نسرین ہمیں ایک دوسرے سے قریب لانے کے باعث پُورے خاندان میں بہت معتبر بن گئی ہے۔"

یوسف مسکرایا اور پھر اچانک اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور وُہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "چچا جان! مجھے اظہارِ تشکّر کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ مَیں یہ سوچتا ہوں کہ آپ اور چچی بلقیس کے بغیر میری دُنیا کتنی ویران اور اُداس ہوتی۔"

بلقیس بولی "بیٹا تمہیں معلوم نہیں کہ تم ہماری دُنیا میں کتنی خوشیاں لے کر آتے ہو۔"

عبدالعزیز نے کہا "دیکھو یوسف! بلقیس تمہیں دیکھ کر جس قدر خوش ہوتی ہے۔ اُسی قدر تمہیں اُن سے خوف زدہ رہنا چاہیے کیونکہ جب اُنھیں غصّہ آتا ہے تو یہ کبھی نہیں دیکھتیں کہ وُہ غریب جو اُن کے تیر و نشتر کا ہدف بن چکا ہے

ان سے کتنا پیار کرتا ہے؟

"نہیں چچا جان"۔ یوسف مسکرایا "مجھے یقین ہے کہ چچی جان کو مجھ پر کبھی غصہ نہیں آئے گا"۔

عبدالعزیز نے گلاس اُٹھا کر پانی کے چند گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "بیٹا میں تمہیں صرف محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اگر مجھے دفتر میں زیادہ دیر ہو گئی تو ممکن ہے کہ گھر آنے کی بجائے وہیں آرام کر لوں تمہیں اُٹھنے کی ضرورت نہیں۔ خدا حافظ"!

عبدالعزیز نے غسل خانے میں جا کر ہاتھ صاف کیے اور وہیں سے باہر نکل گیا۔

یوسف نے قدرے توقف کے بعد بلقیس کی طرف دیکھا اور کہا "چچی جان! میرے لیے اسی وقت دُعا کریں"۔

وہ بولی "بیٹا! مَیں ہر وقت تمہارے لیے دُعا کیا کرتی ہوں"۔

"وہ مجھے معلوم ہے چچی جان لیکن آپ اِس وقت میرے لیے یہ دُعا کریں کہ مجھ سے کوئی ایسی حماقت نہ ہو جائے جس سے آپ کو غصہ آ جائے"۔ "بیٹا مجھے تم پر غصہ نہیں آ سکتا اور قدسیہ کے بیٹے کو یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ مجھے اُس کی حماقتوں پر بھی پیار آئے گا"۔

"چچی جان! آپ دعا ضرور کریں کیوں کہ چچا جان نے مجھے بڑی سنجیدگی سے وارننگ دی تھی"۔

"نہیں بیٹا! انہوں نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی ان کا خیال ہو گا کہ میں کسی بے خیالی میں تمہاری دِل آزاری نہ کر بیٹھوں اور تم روٹھ جاؤ۔ اِس لیے مجھے گفتگو میں بہت محتاط رہنا چاہیے"۔

یوسف مسکرایا "چچی جان! اگر یہ بات ہے تو مَیں اسی وقت ٹیسٹ دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کے جی میں جو آئے کہتی جائیں اور میں مسکراتا رہوں گا، روٹھنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بیٹا ماں سے اگر رُوٹھے گا تو کہاں جائے گا"۔ بلقیس نے قدرے توقف کے بعد کہا "بیٹا تم نے مجھ سے یہ نہیں پُوچھا کہ تمہاری ماں نے جان کنی کے وقت مجھ سے کیا باتیں کی تھیں"!

"چچی جان! مجھے پُوچھنے کی ضرورت نہ تھی مَیں یہ بات جانتا تھا اور جو باتیں مَیں نہیں سُن سکا تھا ان کے متعلق بھی میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ وہ یہی تھیں ویسے چچی جان میرے کان بہت تیز ہیں اور جن باتوں کا میری زندگی کے ساتھ اتنا گہرا تعلق تھا وہ جاننے کے لیے میری حسیات پُوری طرح بیدار تھیں۔ مَیں ساری عمر اس بات پر آپ کا شکر گزار رہوں گا کہ جب امی جان آخری سانس لے رہی تھیں تو آپ نے ان کی سب سے بڑی اُلجھن اور بے چینی دُور کر دی تھی"!

بلقیس آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی "بیٹا یہ کوئی احسان نہیں تھا بلکہ جو خواہش ان کے دل میں تھی وہ میرے دل میں بھی تھی۔ انشاءاللہ! آج تمہیں میری طرف سے کوئی انعام ملے گا"۔

"وہ کیا ہو گا چچی جان"؟

"بیٹا وہ انعام یہ خوشخبری ہے کہ فہمیدہ، نسرین اور اُن کے والدین کل صبح یہاں آ رہے ہیں۔ یہ بھائی جان پر منحصر ہے کہ وہ کب پہنچیں گے۔ اگر ان کا موڈ بن گیا تو انشاءاللہ نماز سے فارغ ہوتے ہی چل پڑیں گے۔ فہمیدہ نے کالج کی چند کتابیں خریدنی ہیں لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ سب کا اوّلین مقصد تمہیں دیکھنا ہے"۔

یوسف نے جھجکتے ہُوئے کہا "چچی جان! اگر آپ مجھے اِس قابل سمجھتی ہیں تو مَیں بہت خوش قسمت ہوں"!

"تم یقیناً بہت خوش قسمت ہو بیٹا! عام حالات میں شاید وہ اتنی جلدی یہاں آنے کا پروگرام نہ بناتے لیکن تمہارے چچا نے اپنے بھائی سے خلاف توقع ذرا

کھل کر بات کی تو وُہ فوراً تیار ہو گئے اور بیٹا سنو جب میں فہمیدہ کی ماں سے تمہاری پریشانی کا ذکر کر رہی تھی تو مجھے ٹیلی فون پر فہمیدہ کی ہلکی ہلکی سسکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں ۔۔۔ اچھا بیٹا یہ بتاؤ اس خبر سے بڑھ کر کیا انعام ہو سکتا ہے"؟ یوسف مغموم لہجے میں بولا "چچی جان جب مَیں بہت چھوٹا تھا تو امی جان مجھے کوئی خوبصورت کھلونا دیا کرتی تھیں تو ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ ہُوا کرتی تھی جو مَیں آپ کے چہرے پر دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میں اس کے سوا کچھ نہیں سوچتا کہ اپنے کمرے میں جاؤں وضو کروں اور اللہ کے حضور سربسجود ہو جاؤں"

بلقیس نے نوکر کو بلوا کر حکم دیا "تم یوسف صاحب کو بیڈ روم میں لے جاؤ ان کے لیے دُودھ اور پانی رکھوا دو اور یہ بھی دیکھ لو کہ غسل خانہ صاف ہے کہ نہیں ایک جائے نماز بھی وہاں رکھوا دو"۔

تھوڑی دیر بعد یوسف نے بیٹھک میں جا کر نماز پڑھی دعائیں مانگیں اور کچھ دیر صحن میں ٹہلنے کے بعد بیٹھک کی چھت پر چڑھ گیا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ تاروں کی روشنی یکایک بڑھ گئی ہے۔ سردی کے باوجود ہوا کے جھونکے اُسے خوشگوار محسوس ہو رہے تھے۔ پھر کچھ دیر ٹہلنے کے بعد اس پر لکھنے کا موڈ طاری ہو گیا اور وہ نیچے جا کر بیٹھک میں ایک کشادہ میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے میز کا دراز کھولا تو وہ فل سکیپ کاغذ سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے چند کاغذ نکال کر میز پر رکھے اور لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

"مہر و ماہ سلامت رہو!

یہ وہ خط ہے جو تمہیں بھیجنے کی جسارت کرنے کے بجائے کہیں چھپا کر رکھ لُوں گا اور کبھی کبھی تجدید عہد کے لیے خود ہی پڑھ لیا کروں گا۔ یہ ایک مشہور شہزادی کا نام ہے۔ ابھی مَیں چھت پر کھڑا جھلملاتے ہوئے تاروں کو دیکھ رہا تھا تو تمہیں پکارنے

کے لیے مجھے مہر و ماہ کے الفاظ پسند آ گئے۔ دیکھیے مسئلہ ذاتی پسند کا ہے۔ ذوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر مَیں سوچ میں پڑ جاؤں تو فہمیدہ کے علاوہ اور کوئی نام مجھے پسند نہیں آئے گا۔ مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ آئندہ جو چیز مجھے پسند آیا کرے گی وہ تمہارے نام کا حصہ بن جایا کرے گی۔ مجھے اس خوشی میں نیند نہیں آئے گی کہ آپ کل تشریف لا رہی ہیں۔ خدا کرے کہ ابا جی علی الصباح سفر کے موڈ میں ہوں اور آپ اچانک یہاں پہنچ جائیں جب مجھے کوئی اور کام نہیں ہوتا تو مَیں اپنی والدہ کی قبر پر جاتا ہوں اور وہاں فاتحہ خوانی کے ساتھ یہ وعدہ بھی دہرایا کرتا ہوں کہ ان کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنا میری زندگی کا ایک مقدس فریضہ ہے۔ مَیں نسرین، تمہارے والدین اور بڑی ماں جی کی بلند ترین توقعات پوری کروں گا۔

امتحان قریب آ رہا ہے مجھے پچھلی کمی پورا کرنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑے گی لیکن سرِدست مَیں اپنا مسوّدہ مکمل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انشاء اللہ آج یہ کام شروع کروں گا اور آپ کے یہاں آنے کی خوشی میں جو تحفہ پیش کروں گا وہ میری پہلی کتاب ہو گی پُوری کتاب نہیں ہو گی شہزادی صاحبہ! کیونکہ آخری صفحات لکھنے کے لیے مجھے وقت کا انتظار کرنا پڑے گا اور ہمیں اللہ کی بارگاہ میں بہت سی دُعائیں کرنا پڑیں گی کہ اس کی تکمیل ہماری خواہشات کے مطابق ہو۔

مَیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بعض لوگوں کی تقدیس کے احترام میں مجھے نئے مسوّدے میں ان کے نام تبدیل کرنے پڑیں گے اور بعض واقعات اور مقامات میں بھی کچھ ردّ و بدل کرنا پڑے گا اور یہ سب اس لیے ہو گا کہ میری کتاب میں کئی ایسے کردار آئیں گے جن کی اصل شخصیتیں مَیں زمانے کی نگاہوں سے اُوجھل رکھنا چاہتا ہوں۔

فہمیدہ! اِس وقت میرے ذہن میں ہزاروں باتیں ہیں اگر لکھنا شروع کر دوں تو ایک اور کتاب بن جائے گی۔ مَیں انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا چاہتا

ہوں کہ جب میرے گرد وپیش تمام روشنیاں گل ہوگئی تھیں۔ میرے سامنے کوئی منزل اور راستہ نہ تھا تو تمہاری یاد میرا آخری سہارا بن گئی تھی۔ پھر ایک دن جب کہ میرے دل پر والدہ کے زخم بہت تازہ تھے۔ میں ریلوے سٹیشن پر کھڑا کانگڑہ سے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا اور دُور سے گاڑی کا دھواں دکھائی دیا اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ اِس دھوئیں کے بادلوں سے میری زندگی کی مسکراہٹیں نمودار ہونے والی ہیں، پھر بڑی ماں جی سے ننھی نسرین سے اور آپ کے والدین سے باتیں کرتے ہُوئے میں نے محسوس کیا کہ میں نے پُوری قوت سے زندگی کا دامن پکڑ لیا ہے اور میرے تصورات حقیقت بن کر میرے سامنے آگئے ہیں۔

فہمیدہ! اِس وقت شاید میں تمہیں یہ نہ سمجھا سکوں کہ تمہارے متعلق میں کیا سوچتا ہوں۔ کیونکہ جب میں تمہارا تصور کرتا ہوں تو سوچ ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ تمہیں وُہ سب کچھ دے جو مجھ جیسا تہی دست انسان نہیں دے سکتا۔

جب تم سے آزادی کے ساتھ باتیں کرنے کا وقت آئے گا تو میں تمہیں یہ سمجھا سکوں گا کہ بعض لوگ اچانک زندگی کا سہارا بن کر آتے ہیں اور زندگی سے زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں۔ معاف کرنا اِس وقت وہ بے شمار باتیں میری سمجھ میں نہیں آسکتیں جو ایک شہزادی کے شایانِ شان ہوں۔

یوسف''

یوسف نے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھے کرکے بستر کے ساتھ تپائی پر رکھ دیے اور پھر اطمینان سے لیٹ کر انھیں پڑھنا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد اس نے اچانک بستر سے اُٹھ کر بعض الفاظ میں ردّوبدل کیا اور کچھ دیر باہر نکل کر صحن میں ٹہلتا رہا جب خنکی محسوس ہونے لگی تو وہ اندر جا کر بستر پر لیٹ گیا اور لکھے ہوئے کاغذ دوبارہ پڑھنے شروع کر دیے۔ پھر یکایک اُسے اُونگھ آگئی اور کاغذ اُس کے ہاتھ سے گر کر بکھر گئے۔

وُہ خواب کی حالت میں اپنے گاؤں کے کھیتوں میں گھوم رہا تھا۔ فہمیدہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ کانگڑہ کے ایک بلند پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور فہمیدہ اور نسرین اُس کے پیچھے آرہی تھیں۔ وہ پھل سے لدے ہوئے ایک انجیر کے درخت پر چڑھ رہا تھا اور نسرین جھولی تانے اپنی بہن کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ ایک آبشار کی طرف بڑھ رہا تھا اور نسرین اس کا بازو پکڑ کر چلا رہی تھی "بھائی جان آگے نہ جائیے۔ یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔" پھر اُسے کمرے میں ہلکی ہلکی آہٹ اور دبے دبے قہقہے سنائی دینے لگے کچھ دیر وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ نسرین کہہ رہی تھی "آپا جی بہت دیر ہوگئی ہے مجھے تو خوف آتا ہے ایسی گہری نیند سے میرا خیال ہے کہ آپ انہیں جگا دیں"۔ فہمیدہ کی آواز سنائی دی "بے وقوف شور نہ مچاؤ ورنہ میں پٹائی کردوں گی"۔

"آپا جان آپ کیا لکھ رہی ہیں" "بے وقوف چپ رہو"۔

یوسف نے آنکھیں کھولیں، نسرین بولی "السلام علیکم بھائی جان! اگر میں اب شور مچاؤں تو آپ کی نیند تو خراب نہیں ہوگی؟"

"تمہاری آواز سے میری نیند کبھی خراب نہیں ہوتی" یوسف نے جواب دیا۔

فہمیدہ جو ہاتھ میں قلم لیے میز کے سامنے بیٹھی تھی بولی "اور میری آواز سے؟"

"اگر میں نے سوال کا صحیح جواب دیا تو آپ ناراض ہو جائیں گی"۔

"میں کیوں ناراض ہونے لگی؟"

"دیکھئے شہزادی صاحبہ اگر میں دنیا میں نہ ہوتا تو بھی آپ کی آواز سُن کر اُٹھ بیٹھتا۔ میرا جواب غلط نہیں ہے لیکن آپ یقیناً بُرا مانیں گی"۔

فہمیدہ بولی "آپ کا جواب غلط بھی ہے اور مجھے پسند بھی نہیں آیا اور یہ خط جسے آپ نے سنبھال کر رکھنا تھا مجھے مل گیا ہے اور میں نے اس کا مختصر جواب بھی

لکھ دیا ہے۔"

فہمیدہ نے میز سے کاغذ اٹھاکر یوسف کو پیش کر دیا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"یہ خط جو آپ نے سنبھال کر کہیں رکھنا تھا۔ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہے۔ اگر شاعری زیادہ نہ ہوتی تو خط بُرا نہیں تھا۔ بہر حال آپ کی شکر گزار ہوں، لیکن دیکھئے مجھے یہاں رہنے دیجئے۔ سُورج اور چاند بناکر لاکھوں اور کروڑوں میل دُور نہ بھیج دیجئے

آپ کی ایک بات صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض لوگ زندگی کا سہارا بن کر آتے ہیں اور جان سے پیارے ہو جاتے ہیں لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جسے ہم دونوں اپنی زندگیوں سے عزیز سمجھتے ہیں اور وہ پاکستان ہے جس کی دل کش تصویریں مَیں آپ کی آنکھوں سے دیکھا کرتی ہوں۔ جب مَیں آپ کے سپنوں کے پاکستان کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مستقبل کے اُفق پر انتہائی دل فریب رنگوں کی روشنیاں پھیل رہی ہیں لیکن کبھی کبھی مَیں اس خیال سے خوف زدہ بھی ہو جاتی ہوں کہ اگر ہم پاکستان حاصل نہ کر سکے تو کیا ہوگا؟" ———

یوسف نے اطمینان سے اُٹھ کر بیٹھتے ہُوتے جواب دیا۔ "فہمیدہ! مَیں پاکستان پر اتنا ہی یقین رکھتا ہوں جتنا مجھے آج غروبِ آفتاب اور طلوعِ آفتاب پر یقین ہے۔ ہم جس دَور میں پیدا ہُوتے ہیں اس کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے لئے حصُولِ پاکستان یا موت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ پاکستان اس برِصغیر پر آج نہیں، اِس صدی سے نہیں، بلکہ تیرہ صدیوں سے قائم ہو رہا ہے۔ کوئی قوم اپنے مستقبل کو اپنے حال اور ماضی سے جدا نہیں کر سکتی۔ کسی نے اُن قافلوں کو رُکتے نہیں دیکھا جن کے پیشرواُن کے راستوں پر اپنے خون کی روشنائی بکھیر جاتے ہیں۔ فہمیدہ! مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مستقبل کا ہر راستہ پاکستان کی طرف جاتا ہے

اور یہ ایک خواب نہیں ہے۔"

فہمیدہ بولی:

آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو اُمیدیں آپ نے پاکستان سے وابستہ کی ہیں وہ پُوری نہیں ہوئیں تو کیا ہوگا؟"

" دیکھئے! میرے دِل میں کبھی یہ خدشہ پیدا نہیں ہوا کہ میری امیدیں پوری نہیں ہوں گی اگر مجھے کسی غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تو بھی میں سوچوں گا کہ میں کہاں تک اس کا ذمہ دار ہوں اور مَیں نے اپنی قوم کو فکر و عمل کا صحیح راستہ دکھانے میں کس حد تک اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ فہمیدہ! جب قافلے چلتے ہیں تو ان کے راستے میں نشیب و فراز بھی آتے ہیں۔ اگر رات اندھیری ہو اور ہاتھوں میں مشعلیں نہ ہوں تو زیادہ ٹھوکریں لگتی ہیں۔ مَیں اس وقت صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کو مجھ سے یہ شکایت نہیں ہوگی کہ جب پاکستان کا قافلہ کسی نازک موڑ سے گزر رہا تھا تو مَیں نے پوری قوت اور ایمان داری سے اس کو آوازیں نہیں دی تھیں اور جب ہمیں تاریکیوں نے گھیر لیا تھا تو میں نے دونوں ہاتھوں سے مشعلیں بلند نہیں کی تھیں۔ اللہ نے مجھے قلم دیا ہے اور مَیں اپنے وقت سے بہت دُور آگے دیکھ سکتا ہوں مَیں پوری سنجیدگی اور دیانت سے علامہ اقبالؒ کے حسین سپنے کی تعبیریں لکھتا رہوں گا اور جب میری طاقت جواب دے جائے گی اور میرے ہاتھ سے قلم گر پڑے گا تو مجھے اس دنیا میں آخری سانس لیتے وقت بھی یہ اطمینان ہوگا کہ میں نے اپنے دل و دماغ اور جسم و روح کی تمام توانائیاں اپنے مقدس مشن کی تکمیل پر صرف کر دی ہیں۔ میرے اللہ! مَیں اس سے بہتر نہیں کر سکتا تھا۔"

فہمیدہ بڑی کوشش سے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی:

"یوسف" اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ جب آپ پاکستان کے سپنے کی حسین تعبیریں لکھا کریں گے تو اللہ کا ہاتھ آپ کے سر پر ہوگا اور آپ کی توانائیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ پاکستان کی منزل اچانک بہت قریب آگئی ہے۔ آپ جلدی سے تیّار ہو کر آئیں میں آپ کا ناشتہ رکھواتی ہوں چچی جان کو اس قدر پریشان نہ کیا کریں۔"

فہمیدہ باہر نکل گئی اور نسرین یوسف کا ہاتھ پکڑ کر سہمی ہوئی آواز میں بولی:

"بھائی جان! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیا کریں میں بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں روک رہی تھی۔"

یوسف نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "نسرین تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ پاکستان تمہارا وطن ہوگا اور میں اِس وطن کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکوں گا۔"

"بھائی جان" نسرین نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان آپ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بہت کچھ مانگنا چاہیئے اور میں بہت کچھ مانگا کرتی ہوں: مجھے پاکستان کی ضرورت ہے اِس سے آپ کی ضرورت کم نہیں ہو جاتی۔ میں آپ کے بغیر پاکستان کا تصوّر نہیں کر سکتی۔ میں آپ کی شفقت سے محروم ہو کر زندہ رہنا بھی پسند نہیں کروں گی۔"

"میری ننھی شہزادی! تم پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنتا ہُوا دیکھو گی اور تم اس بات پر بھی فخر کیا کرو گی کہ تمہارا بھائی اس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک تھا۔"

"صرف بنیاد رکھنے والوں میں نہیں۔ بھائی جان! میں اس عمارت کی دیواریں اور چھت تعمیر کرتے ہوئے بھی آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اس دُنیا میں وہ سب کچھ دیکھنا

چاہتی ہوں جو صرف میرا بہادر بھائی سر کر سکتا ہے بھائی جان! میں اللہ سے دعا کیا کرتی ہوں کہ جب تک ہم سب بہت بوڑھے نہیں ہو جاتے آپ زندہ رہیں آپ بہت اچھی کتابیں لکھیں ــــ بہت سی کتابیں لکھیں اور میں اور میری طرح لاکھوں افراد انھیں بار بار پڑھا کریں۔ آیئے بھائی جان وہ سب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔"

خـتم شـد

”عرضِ حال“

زندگی میں میرے ساتھ دو بار ایسا ہُوا ہے کہ جب مجھ پر کسی بیماری کا حملہ ہوتا ہے تو میں کوئی بڑا کام شروع کر دیتا ہُوں ـــــــ ۱۹۵۴ سے ۱۹۵۹ تک میں جوڑوں کے تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہوا تو میں نے بستر پر پڑے پڑے دو ناول ”معظم علی“ اور ”اور تلوار ٹوٹ گئی“ اِملا کروا دیے ـــــــ

پھر ۱۹۸۲ سے لے کر اب ۱۹۸۹ تک ـــــــ مُجھے بستر پر لیٹنا پڑا ہے تو دو اور طویل کتابیں (ا) ”پردیسی درخت“ اور (ب) ”گم شدہ قافلے“ اِملا کرواتے ہُوئے مجھے بیماری سے زیادہ اس بات سے تکلیف ہوئی تھی کہ مجھے اِملا کروانے کے لیے بعض اِنتہائی ناموزوں لوگوں سے واسطہ پڑا۔

اِسی عرصے میں دوسری بات یہ ہُوئی کہ میری آنکھوں کی تکلیف، جس کے متعلق گزشتہ پچیس سال سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ میری یہ تکلیف بہت کم ہو گئی ہے، پھر ایک بار پُرانی شدت کے ساتھ ظاہر ہُوئی اور وہ بیماری یہ تھی کہ کئی برس لیمپ کی روشنی میں کام کرنے کے باعث میں چند سال قبل کُکروں کی شدید تکلیف میں مبتلا رہا ـــــــ پپوٹوں کے اندر، رائی کے دانوں جتنے چھوٹے چھوٹے سخت قسم کے دانے پیدا ہو گئے تھے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب یہ تکلیف شروع ہُوئی تھی تو آنکھوں کے مشہور مُعالج سرہنری ہالینڈ کوئٹہ میں تھے۔ لیکن اُس زمانے میں، اُن کے پاس بھی نیلا تھوتھا معمولی مقدار میں پانی میں مِلا کر آنکھوں میں ڈالنے کے سِوا کوئی اور عِلاج نہ تھا۔ پھر چند سال بعد ایک ایسی دوائی آ گئی جو اس تکلیف کے لیے کافی موثر تھی ـــــــ

جب دوبارہ مجھے یہ تکلیف شروع ہُوئی تو اِتفاقاً آنکھوں کے مشہور و معروف معالج ڈاکٹر لیسین دُرّانی صاحب سے مُلاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے کھڑے کھڑے

میری آنکھوں کو دیکھ کر کہہ دیا ـــــــ ”بھئی، کل تم میرے پاس آ جاؤ، ایک آنکھ کی تکلیف تو اُسی روز ختم ہو جائے گی دوسری دو تین دِن بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے دانے، جو تمھارے پپوٹوں کے اندر جم گئے ہیں، نِکال دیے جائیں گے“ ـــــــ

ڈاکٹر دُرّانی صاحب اس انداز سے بات کر رہے تھے جیسے یہ کوئی مرض ہے ہی نہیں۔ میں مُحترم ڈاکٹر افضل اِعزاز صاحب کے ساتھ اُن کے پاس پہنچا۔ یہ اُن کا اپریشن کا دن نہیں تھا۔ بہرحال، انھوں نے مجھے اپنے دفتر میں ہی میز پر لِٹا کر ایک دوائی ڈالی اور چند منٹ بعد وہ چھوٹے چھوٹے دانے جن کی عُمر یقیناً میری عُمر سے نِصف ضرور ہوگی، نِکال ڈالے اور مجھے یہ محسوس تک نہ ہُوا کہ یہ کوئی اپریشن تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر افضل اعزاز صاحب مجھے کار پر گھر چھوڑ گئے۔ چند دِن بعد میرے اندر اِتنی خود اِعتمادی آ چکی تھی کہ میں ایک نوکر کو لے کر ہسپتال پہنچا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے اپریشن کا دن تھا۔ انھوں نے اطمینان سے میری دُوسری آنکھ بھی صاف کر دی۔

اسی تکلیف سے تو مجھے نجات مِل گئی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اچھی طرح دیکھنے کے بعد مجھے بتایا: ”تمھاری آنکھوں میں سفید موتیا اُتر آیا ہے تاہم دو تین سال تم بڑے اطمینان سے کام کر سکو گے۔“

تین سال بعد ـــــــ ”گم شدہ قافلے“ بالکل قریب الاختتام تھی کہ مجھے پھر تکلیف ہُوئی اور میں ڈاکٹر دُرّانی صاحب کے پاس پہنچا اور کہا ”ڈاکٹر صاحب، میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ کی وجہ سے میرے اندر جو خُود اِعتمادی پیدا ہُوئی تھی اس کی بدولت میں دو کتابیں ختم کر چکا ہُوں۔“ ڈاکٹر صاحب نے میری آنکھوں کا بغور معائنہ کرنے کے بعد کہا ”تمھاری آنکھوں میں جو کنکریشن بچ گئے ہیں وہ تمام صاف کر دیے جائیں گے اور میں تمھیں یہ خوشخبری بھی دے سکتا ہُوں کہ موتیا جہاں تھا، وہیں رُک گیا ہے اور تم دس بیس اور کتابیں لِکھ سکو گے۔“

”دس بیس نہیں ڈاکٹر صاحب، اب میں صرف ایک کتاب اور لکھنا چاہتا ہوں اور وہ مجاہدینِ افغانستان کے متعلق ہوگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھنے میں میری رہی سہی توانائی ختم ہو جائے گی۔“

تاہم آج میں اتنا کہنے پر ہی اکتفا کر رہا ہوں کہ آپ کے ہاتھوں میں "پردیسی درخت" دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں اور اگر میری آنکھوں میں پھر کوئی تکلیف نہ ہو گئی تو دو ایک ماہ میں اپنی دوسری کتاب "گم شدہ قافلے" بھی آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں گا ——— انشاء اللہ

نسیم حجازی